سلطانِ ما محمدؐ

(مقالاتِ سیرت)

مولانا عبدالماجد دریابادی



مقدمہ و ترتیبِ نو
تحسین فراقی

مقبول اکیڈمی شاہراہ قائدِ اعظم لاہور

۱۹۹۳ء

مقبول اکیڈمی
دیال سنگھ مینشن شاہراہ قائداعظم لاہور

قیمت : ۱۰۰/۰۰ روپے

پرنٹرز : معظم پرنٹرز لاہور

ما طالبِ خدائیم بر دینِ مصطفائیم
بر درگہش گدائیم سلطانِ ما محمدؐ

—— معین الدین ہرویؒ ——

فہرست

مقدمہ	۱۱
سلطان ما محمدؐ	۲۷
یتیم کا راج	۴۳
یتیم کی جیت	۵۷
دو راستے	۷۱
ذکرِ رسولؐ کی بلندی	۸۳
سیرت نبویؐ اور علمائے فرنگ	۹۳
محبوبؐ سے خطاب	۱۱۱
فقرِ محمدیؐ	۱۲۳
صابرِ رسولؐ	۱۳۳
عتابِ محبوب	۱۴۵
میلاد کی روایات	۱۵۳
ناک کا داغ	۱۶۱
اُسوۂ حسنہ	۱۷۵
ولادت باسعادت	۱۸۳
رحمۃٌ للعالمینؐ	۱۹۱
یتیموں کا والی۔ غلاموں کا مولیٰ	۱۹۹
یوم النبیؐ کا ایک نشریہ	۲۰۵
سیرۃ النبیؐ یا صحیفہ سلیمانی	۲۱۳

دیباچۂ طبع ثانی

سُلطانِ ما محمدؐ پہلی دفعہ ۱۹۸۲ء میں لاہور کے ایک ادارے مکہ بکس نے شائع کی تھی۔ اِس پہلے ایڈیشن میں بعض واقعاتی اغلاط اور کتابت کی کوتاہیاں راہ پاگئی تھیں۔ زیرِ نظر ایڈیشن میں نہ صرف ان تسامحات کو دُور کر دیا گیا ہے بلکہ مولانا دریا بادی کا ایک اور مضمون "سیرۃ النبیؐ یا صحیفۂ سلیمانی" بھی شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔ مولانا کا یہ مضمون انہی کی ادارت میں نکلنے والے ہفت روزہ "سچ" کے ۱۴ اور ۲۱ اپریل ۱۹۲۳ء کے شماروں میں دو قسطوں میں شائع ہُوا تھا۔ سید سلیمان ندوی کی "سیرۃ النبیؐ" پر مولانا کا یہ مضمون ان کی وسعتِ نظر کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

سُلطانِ ما محمدؐ کی مکرر اشاعت کے لیے مَیں مقبول اکیڈمی کے مہتمم جناب ملک مقبول احمد صاحب کا ممنون ہوں۔

لاہور۔ ۳۱ رمئی ۱۹۹۲ء

(ڈاکٹر) تحسین فراقی
شعبۂ اُردو یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

مقدّمہ

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۳ء — ۱۹۷۷ء) اردو ادب کی ان چند قاموسی شخصیات میں سے تھے جنھوں نے اردو نثر کو عمودی اور افقی ہر دو جہتوں ثروت بخشی۔ ان کی فکر و فرہنگ کے میدان اتنے وسیع اور ان کے نتائج فکر اتنے متنوع اور متلون ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ انھوں نے فلسفہ، نفسیات، دینیات، ترجمہ، تفسیر، ترتیب، تہذیب، تبصرہ، تمثیل، طنزیات، ادب و شعر اور صحافت — ان تمام کوچوں کی سیاحت کی اور اپنے نقوشِ کفِ پا یادگار چھوڑے۔ مطالعے کی چاٹ اوائلِ عمر ہی سے پڑ گئی اور بارہ سال کی عمر میں ان کا پہلا مضمون اودھ اخبار میں چھپا۔

مولانا ماجد کو علم و فضل، حق شعاری اور صدق گفتاری کی روایات ورثے میں ملی تھیں۔ ان کے دادا مولانا مفتی محمد مظہر کریم اپنے وقت کے معروف عالمِ دین تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن چند عظیم اور حق گو ہستیوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا ان میں مفتی مظہر کریم بھی شامل تھے، چنانچہ انھیں بھی مولانا فضلِ حق خیرآبادی اور مفتی عنایت احمد کے ساتھ سات سال کے لیے جزائر انڈمان بھیج دیا گیا۔ وہیں مفتی صاحب نے ایک ضخیم عربی کتاب کو اردو میں منتقل کیا۔ وہاں کے انگریز افسر نے خوش ہو کر ان کی سزا میں تخفیف کرا دی۔ مولانا ماجد بھی اپنے دادا کی طرح فرنگی کے خلاف نہ سہی، فرنگی مدنیت کے خلاف کم و بیش تمام عمر صف آرا رہے اور اس کی تدلیس ملمع کاری اور چوب پائی کو بے نقاب کرتے رہے۔

مولانا ماجد کی ابتدائی تعلیم و تربیت دینی ماحول میں ہوئی۔ سکول کی تعلیم تک تو وہ ایک سیدھے

اور سچے مسلمان نوجوان رہے لیکن کالج کی تعلیم نے رفتہ رفتہ ان میں تشکیک وارتیاب کے وہ بیج بو دیئے کہ انھیں خود کو "ریشنلسٹ" کہلانے میں فخر محسوس ہونے لگا اور دین اور اس کے متعلقات کی ان کی نظر میں وقعت نہ رہی۔ مولانا ماجد نے اعلیٰ تعلیم کیننگ کالج میں حاصل کی جو بعدازاں لکھنؤ یونیورسٹی بنا۔ اسی کالج کے "سایہ عاطفت" میں معروف ترقی پسندوں سجاد ظہیر، ڈاکٹر علیم، احتشام حسین اور علی سردار جعفری نے تعلیم و تعلم کے مراحل طے کئے تھے۔ ماجد ارتیاب کے اس ظلمات میں کم ازکم نو دس سال تک بھٹکتے رہے

ماجد صاحب نے اپنی آپ بیتی میں اپنے الحاد اور اس کے اسباب و علل کا جو تجزیہ فراہم کیا ہے وہ بہت چشم کشا ہے۔ ماجد صاحب کی گمراہی کا باعث منطق پر مل کی کتابوں کے علاوہ "عضویات ذھنی" اور "مرضیات دماغی" نام کی ڈاکٹر ماڈسلے کی دو کتابیں تھیں۔ تشکیک اور ارتیاب کی کمانی ذھن میں ایک دفعہ کھلی تو پھر کھلتی ہی چلی گئی۔ اسی عرصے میں ماجد نے شبلی کی "الکلام" کو بنیاد بنا کر عقائد اسلامی، وجود باری، نبوت اور ضرورت مذہب وغیرہ پر تنقید لکھی جو چھ قسطوں میں "الناظر" کے شماروں میں چھپی۔ کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے قیادت کی نفسیات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی جو ٹی فشر اَن وِن لمیٹڈ لندن نے چھاپی اور جس کے چھپتے ہی انگلستان اور ھندوستان کے رسائل و جرائد میں اس پر تعریفی تبصرے ہونے شروع ہو گئے۔ اس کتاب میں بظاہر تو اجتماع کی نفسیات کو بنیاد بنا کر تجزیہ و تعبیر کا کام انجام دیا گیا تھا لیکن فی الاصل اس میں مستشرقین کے سے حربے استعمال کئے گئے تھے اور بین السطور میں وہی مذہب دشمنی اور تشکیک آفرینی کارفرما تھی جو مستشرقین میں سے اکثر کا شیوہ رہا ہے اور اب تک ہے۔ ماجد کی اسی کتاب یعنی سائیکالوجی آف لیڈرشپ کا مفصل اردو روپ "فلسفۂ اجتماع" کے نام سے شائع ہوا جسے بعدازاں ماجد نے اپنی تصانیف کی فہرست سے خارج کر دیا۔

سائیکالوجی آف لیڈرشپ کے حق میں انگلستان کے رسائل میں توصیفی تبصرے تو بیشتر شائع ہوئے مگر "کرسچیئن ورلڈ" میں ایک مخالفانہ تبصرہ بھی شائع ہوا۔ اسی طرح ماجد کی "فلسفۂ اجتماع" پر بہت سے ھندوستانی اخبارات و رسائل میں مخالفانہ اور موافقانہ تبصرے شائع ہوئے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ان کی تکفیر کا فتویٰ جاری کر دیا لیکن متعدد علماء نے بہت سے فتوے مصنف کی عدم تکفیر میں بھی شائع کئے جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، سید سلیمان ندوی، عبدالمجید فرنگی محلی اور مولانا شبیر علی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن علماء نے ماجد صاحب کے عدم تکفیر کے فتوے جاری کئے ان کا

مقصد کیا تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں بات اصل میں یہ ہے کہ یہ حضرات بھی ماجد صاحب کی تشکیک سے یقیناً واقف تھے اور ان کی کتابوں میں پائی جانیوالی گمراہی کی زیریں سطح سے بھی آگہی رکھتے تھے لیکن وہ قرآن حکیم کی اس آیت کے مصداق کہ

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ

ماجد کو دھیرے دھیرے دوبارہ اسلام کی طرف لانا چاہتے تھے۔

ماجد کی اسلام کی طرف مراجعت میں جہاں ان کے ذاتی مطالعے کو بہت دخل ہے وہاں محمد علی جوہر اکبر الہ آبادی اور سید سلیمان ندوی کی حکمت اور دور نگاہی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ماجد صاحب اور ان بزرگوں کے درمیان مراسلت بڑی مفید رہی۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس ضمن میں اکبر، جوہر، ندوی (بلکہ مہدی افادی بھی) کے خطوط کے چند اقتباسات پیش کر دیئے جائیں تاکہ واضح ہو سکے کہ موعظہ حسنہ کسے کہتے ہیں اور رجوع الی اللہ کی ترغیب میں حکمت کا تناسب کیا ہونا چاہیئے۔

"سائیکالوجی آف لیڈر شپ" پر سب سے مفصل تبصرے تو محمد علی جوہر نے کیے جو مولانا ماجد کے نام ان کے خطوط کے تقریباً پینتالیس چھیالیس صفحات کو محیط ہیں اور خطوطِ مشاہیر (مرتبہ عبدالماجد دریابادی) ہیں شامل ہیں۔ ان خطوط سے مستشرقین کی ناطرفداری اور نام نہاد خالص علمی تحقیق کا بھی صحیح چہرہ سامنے آتا ہے۔

"سائیکالوجی آف لیڈر شپ" پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے محمد علی جوہر نے لکھا:

"میری تنقید کا آخری عنوان آپ کے ان تذکروں سے متعلق ہے جو آپ نے پیغمبرِ خدا اور قرآن مجید کی تمثیل لاتے وقت کیے ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سچے اور حقیقی مسلمان ہیں۔ اس بنا پر مجھے سخت حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے ایسی مقدس شخصیت اور ایسی مقدس آسمانی کتاب کا ذکر کس ہلکے پن سے کیا ہے۔ کیا یہ آورد و تصنع اپنی "ناطرفداری" اور خالص علمی تحقیق کے اظہار کے لئے ہے یا کیا؟ یہ سوال میں ایک نقاد نفسیات کی حیثیت سے نہیں کر رہا ہوں؟ جو ایک مسلمان مصنف سے کتاب اللہ و رسول اللہ کے تذکرہ کے وقت ادب و احترام کی توقع رکھتا ہے..... آپ کے لب و لہجہ سے تو صاف عیسائی مشنریوں کی بو آرہی ہے جو یہ دکھانا چاہتے ہیں یا کم از کم پڑھنے والے کے ذہن کو اس جانب منتقل کر دیتے ہیں کہ محمد (جن کے دین پر میں اور میرا سارا کنبہ قربان ہو) نعوذ باللہ ایک پیغمبرِ کاذب یا محض لسان تھے۔"

اسی کتاب میں ماجد صاحب نے مستشرقین کے انداز میں حضور اکرم کو بھی ایک زعیم کے طور پر پیش کیا

تھا۔ چنانچہ محمد علی جوہر نے اپنے اگلے خط (۱۹ر اگست ۱۹۱۹ء) میں انھیں لکھا:

"کہیں آپ آنحضرت صلعم کو مارگولیتھ (یہ میری بدنصیبی تھی کہ آکسفورڈ میں جب میرا ارادہ تحقیق کی ڈگری لینے کا تھا تو یہ میرے رہنما مقرر کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ پیشتر بھی کچھ عربی ان سے پڑھی تھی) وغیرہ کی طرح ایک چلتا ہوا لیڈر تو ثابت نہیں کرنا چاہتے۔ چونکہ یہ نہ آپ کا مفہوم ہو سکتا تھا نہ ہے اس لئے میری توقع بیجا نہیں کہ آپ اپنی تصنیف کو ایک بار اس شبہ کو دل میں جگہ دے کر پڑھیں کہ مصنف کوئی غیر مذہب والا ہے جو مسلمانوں کو یا کم از کم غیر مسلموں کو توضلالت کی طرف آہستہ آہستہ لے جانا چاہتا ہے تاکہ وہ عظمت جو ایک وحی پانیوالے رسول کی اس کے دل میں ہے وہ دُور ہو جائے اور اس طرح دُور ہو کر پڑھنے والوں کو بھی اس تبدیلیٔ خیالات کا احساس نہ ہونے پائے اور اسی لئے بطور ایک نعم البدل کے خلعتِ نبوت اتار کر لیڈری کی گون پہنا دی۔ یہ ہرگز آپ کا خیال نہ تھا نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے مگر جس طرح حساب میں بچے اپنے سوالات کے جوابات کی جانچ کرتے ہیں کہ تقسیم کا ہے تو ضرب کر کے دیکھتے ہیں اور تفریق کا ہے تو جمع کر کے۔ اسی طرح ایک پڑھنے والے جذبات اور اس کے دل پر جو اثرات پیدا ہو سکتے ہیں، ان کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس سلسلۂ تاثر کو الٹ دیا جائے اور تنقید کا ایک نقاد پیش کرتا ہو، اس کو صحیح تسلیم کر کے اور جو اثر کہ آخر کار پڑھنے والوں کے دل پر بہ قول اس کے پڑنا ممکن یا اغلب ہو اسے قبول کر کے پھر کتاب کو پڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ جو نقوش پڑھنے سے بیشتر ہی دل پر نقش ہو گئے تھے، باقی رہتے ہیں یا مٹتے جاتے ہیں؟"

اگلے خط میں جوہر نے ماجد کو خدمتِ اسلام پر کمربستہ ہونے کی ترغیب دی (واضح رہے کہ یہ دَور ماجد صاحب کے الحاد کے شباب کا دَور تھا)

"آپ کو تو بہ فضلہٖ تعالیٰ خدا اور رسولؐ کا انکار نہیں ہے۔ برائے خدا اور رسولؐ اپنی عقل و تمیز اور علم و تحقیقات کو اسلام اور صرف اسلام کے لئے وقف کر دیجئے اور اس دانشِ حاضر کے حجابِ اکبر میں مستور و محجوب نہ رہیئے۔"

ماجد دانشِ حاضر کے حجابِ اکبر سے نکلے تو کندن بن کر نکلے اور انھوں نے خدمتِ اسلام میں گرانقدر کارنامے انجام دیئے۔ انہی کارناموں میں سیرتِ سرورِ عالمؐ پر ان کے وہ مضامین بھی شامل ہیں جو صدق کے مختلف شماروں میں نکلے اور جن کا ذکر ابھی آگے آئے گا۔

اکبرالہ آبادی وہ دوسری بڑی شخصیت تھی جس سے ماجد نے بیحد اثر قبول کیا اور جن کی ہدایات رفع تشکیک میں بیحد معاون ہوئی۔ اکبر نے عین اس زمانے میں جب علما بے تکان ماجد کے خلاف فتوے دے رہے تھے، انھیں لکھا:

"برادرم!

قرآن شوق سے دیکھئے، خوب دیکھئے، یہاں تک کہ بلا مددِ ترجمہ اس کے ظاہری معنی سمجھنے لگیں۔ تفسیر کی تو حد نہیں۔ مذاقِ مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطور تلاوت پڑھا کیجئے۔ ایک سرے سے پڑھ جایئے اور پھر پڑھیے۔ زیادہ نہ رکئے، پڑھتے جایئے۔ ثواب کا عقیدہ نہ سہی، لٹریری لطف و ذوق کا خیال کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی، کسی وقت کوئی آیت دل کو متوجہ کرے گی۔"

۱۱۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کے مکتوب میں لکھا:

"آپ ہنوز راہ میں ہیں، لیکن سیدھی راہ ہے۔ ابھی آپ نہیں جانتے، کیا نعمتیں آپ کو ملنے والی ہیں، انشاء اللہ تعالیٰ۔ ایک شعر قابلِ یاد ہے:

دو سہ گام اگر پئے دل برہش دویدہ باشی
ز جہاں گزشتہ باشی بہ جہاں رسیدہ باشی

اس سے قبل یہی حق آگاہ اور اللہ کے نور سے دیکھنے والا شاعر حضرت نیاز بریلوی کے ایک شعر کی تضمین کر کے ماجد کے بارے میں کہہ چکا تھا:

ماجد کو آپ سمجھیں بیگانۂ طریقت ۔ دل میں مرے تو ہے اک امید کا تصیدہ
ہیں غالباً وہ مصداق اس شعر با اثر کے ۔ ارشاد کر گیا ہے اک مردِ برگزیدہ
"من پاکبازِ عشقم ذوقِ فنا چشیدہ ۔ آہوئے دشتِ ہویم از ما سوا رمیدہ"

خود مہدی افادی جو اپنی تحریر میں خاصے آزاد واقع ہوئے تھے، عقلیات کے بدل قائل تھے اور ماجد صاحب کو "محافظِ عقلیات" کہتے تھے لکھے بغیر نہ رہ سکے:

"میں نے آپ سے لکھنؤ میں ذکر کیا تھا کہ آپ نے گو آنحضرتؐ کی تنقیص نہیں کی تاہم اظہارِ خیال کی باریک نسبتوں میں ایک طرح کی تضحیک پائی جاتی ہے اور یہ متعلمانہ رنگ ہے، مستشرقانہ سنجیدگی نہیں... ایک آدھ لفظ کے ہیر پھیر سے یہ شکایت دور ہو سکتی ہے۔"

جون ۱۹۱۹ء میں مہدی خاں نے ماجد کو لکھا:

"جو کچھ لکھئے "مسلم" بن کر لکھئے کہ سنجیدگی تصنیف کا اقتضاء یہی ہے۔ یہ نکتہ چالیس برس کے بعد سمجھ میں آئے گا لیکن اس درمیان میں آپ کو میں کم سے کم ڈاکٹر لیبان کی طرح فیاض دیکھنا چاہتا ہوں، ورنہ کسی بانیٔ مذہب کی فضیلت کا اعتراف دراصل "میٹھی چھری زہر کی بجھی" کا مصداق ہوگا۔ اردو میں شبلی کے مصلحِ اعظمؐ کو "محمد" نہ لکھئے آنحضرتؐ لکھئے تو لٹریچر آپ کا شکر گزار ہوگا۔"

اسی زمانے میں رسالہ "زمانہ" کانپور میں ماجد نے "مذہب اور ارتقائے تمدن" کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں مذہب کی کلی افادیت کو نمایاں کیا گیا تھا۔ ماجد اس وقت تک عملاً مذہب سے بیزار ہو چکے تھے اور اس صورت حال کا علم سبھی اہلِ علم کو تھا۔ لیکن اس کے باوجود سید سلیمان ندوی نے انھیں بمسرت، مارچ ۱۹۱۵ء میں لکھا:

بنامِ نگارندۂ "مذہب اور ارتقائے تمدن"

غازی بہ تو تی روا ست کا فر بودن

اسی زمانے میں ماجد نے قرآن کی نفسیات پر کتاب لکھنے کا خیال ظاہر کیا سو سید سلیمان کا جواب یوں تھا:

"نفسیات القرآن بشوق لکھئے لیکن داد دینے کیلئے نہ عیب جوئی کیلئے۔ قرآن میں نفسیات کا گُر جو ہے وہ شاید وہی ہو جس کو آپ تحریکِ نفسِ انسانی بذریعہ خطابیات و دعوتِ متلذذات کہیں گے۔ بہرحال اگر آپ اسلام کی حمایت کا اس سے کام لیں گے تو خدارا جلد لکھئے اور اگر کچھ اور نیت ہے تو اس امتِ مرحومہ پر للہ رحم کیجئے۔"

—— ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء

اسی قبیل کے حکمت آمیز خطوط، حضرت تھانوی کی صحبت، کنفیوشس کی تعلیمات کے مطالعے، عطارؔ کی منطق الطیر، جامی کی نفحات الانس، مکتوباتِ مجددِ الف ثانی، بھگوان داس کی کتب (جو کبھی کبھی خود کو "عبدالقادر" بھی لکھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مابعد الطبیعیاتی حقیقت ایک ہی ہے) اور مثنوی مولانا روم نے انھیں بالآخر دوبارہ نورِ ایمان سے منور کیا۔ اور پھر اصل بات تو یہ ہے کہ دنیا بھر کی بیعتیں فسخ ہو سکتی ہیں مگر وہ بیعت کیسے فسخ ہو سکتی ہے جو پہلی بیعت ہے، جو میثاقِ ازلی ہے —— اس پہلی بیعت نے ماجد کو دوبارہ اپنی جانب کھینچ لیا۔ اب ماجد کو احساس ہو چکا تھا کہ "اصل کھلا تو اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے جزئی درجزئی اور اقل قلیل مشاہدہ کو کُل کا قائم مقام سمجھ لیتا ہے اور یہ

نہیں سوچتا کہ جس مشاہدے کو وسیع سے وسیع تر قرار دے رہا ہے وہ اس دنیا کے کل مشاہدات سے کوئی نسبت نہیں رکھتا" ـــــ اب ماجد کا سینہ دوبارہ نورِ حق سے گلزار ہو چکا تھا:

صد کتاب و صد ورق در نار کن
سینہ را از نورِ حق گلزار کن

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال (رومیؒ)

(۲)

سیرتِ نبویؐ ایک سمندر ہے جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنے کے لئے عمرِ خضر بھی کافی نہیں۔ دنیا کی کون سی زندہ و موجود زبان ایسی ہے جس میں رسولِ برحقؐ کا تذکرہ نہ ہو۔ وہ کہیں فارقلیط ہیں تو کہیں منحمنا، کہیں ماذماذ ہیں تو کہیں طاب طاب، کہیں حمطایا ہیں تو کہیں حمیاطا ـــــ قرآن کا یہ فرمان کتنا سچا ہے "کہ ہم نے تیرا ذکر بلند کیا"۔

لفظِ سیرت کا اپنے اصطلاحی معنی میں آغاز تو حضورؐ کے اولیں سیرت نگاروں ہی سے ہو گیا تھا۔ واقدی نے اس لفظ کا استعمال بالکل اسی مفہوم میں کیا جس میں یہ بعد کو مستعمل ہُوا۔ بعض احادیث میں بھی یہ لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہُوا۔ حضرت کعب بن مالکؓ نے غزوہ احد کے موقع پر جو نعتیہ قصیدہ کہا، اس کا ایک شعر ہے:

اَلْحَقُّ مَنْطِقُہٗ وَالْعَدْلُ سِیْرَتُہٗ
فَمَنْ یُجِبْہُ اِلَیْہِ یَنْجُ مِنْ تَبَبٖ

(ان کی بات حق ہے اور ان کی سیرت عدل ہے جس نے ان کی پیروی کی، ہلاکت سے نجات پا گیا)

اردو میں سیرت نگاری کا آغاز کب ہوا، یہ اپنی جگہ ایک الگ اور پھیلا ہوا موضوع ہے۔ پروفیسر انور محمود خالد نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے (اردو نثر میں سیرت رسولؐ) میں اس موضوع کے ساتھ کامل انصاف کیا ہے۔

اردو میں منظوم کتبِ سیرت کا آغاز گیارھویں صدی ہجری میں ہو چکا تھا جبکہ نثر میں تیرھویں صدی ہجری میں اس کا آغاز ہوا۔ دکن میں کثرت سے میلاد نامے، معراج نامے، وفات نامے، نقلی نامے اور

نورنامے لکھے گئے۔ ان میں سے اکثر نظم میں، چند نثر میں اور بعض میں نظم و نثر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ولی ویلوری کی روضۃ الانوار سے لے کر ولی دکنی کے نعتیہ قصیدے تک اور پھر بعد کی دو صدیوں میں ان منظوم کتب سیرت کی تعداد بلا مبالغہ سینکڑوں سے بھی متجاوز ہے۔ اسی طرح اردو میں سیرت رسولؐ کے نثری نمونے دکن میں لکھی جانیوالی ریاض السیر، ممتاز التفاسیر اور فوائد بدریہ سے لیکر شمالی ہند میں لکھی جانے والی چار باغ احمدی (۱۸۵۷ء) تک کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ انہی ابتدائی تصانیف میں ایک معراج العاشقین بھی ہے۔ یہ اگرچہ طے نہیں کہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف ہے یا مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی، بہر حال اس میں نثر میں سیرت رسولؐ کے ابتدائی نقش ملتے ہیں:

"اے محمدؐ! سب خلق کوں تیرے نور سوں پیدا کیا ہوں۔ اس روشنائی میں اپنی تصویر دیکھا۔ سود و نو عالم نورانی، یعنی نورانی سوا بوالارواح ہوا، روحانی سوا بوالاجساد"۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سیرت نگاری میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ اب سیرت کی کتابوں میں نسبتاً زیادہ تفصیل ملتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ چونکہ انیسویں صدی کا دور عالم اسلام کے لئے بالعموم اور برعظیم ہندوستان کے لئے بالخصوص نئے چیلنج اور نئے پیکار لاتا ہے، جن کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی اس لئے سیرت کی ان کتابوں میں منطقی استدلال اور فکری عناصر زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ خطبات احمدیہ سے لیکر جسٹس امیر علی اور مولوی چراغ علی کی تحریرات تک اور وہاں سے شبلی، سلمان منصور پوری، سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی اور مولانا آزاد کے ("الہلال" کے سحر انگیز) مقالات تک سیرت کے دور جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ بہر حال دو سوا دو سو سال کے اس قلیل عرصہ میں اردو نثر میں سیرت محمدیؐ کا ایک وقیع سرمایہ مدون و مسوّدہ ہو چکا ہے ـــ خطبات احمدیہ سے پیغمبر اعظم و آخر تک کا یہ ذخیرہ اردو نثریات کا ایک نہایت اہم باب ہے ـــ ایک سنگ میل ہے، ایک منارۂ نور ہے۔ انور کے اس لازوال ہالے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کے وہ سیرتی مقالات بھی شامل ہیں جنھیں اس سے قبل "مردوں کی مسیحائی" کے نام سے ادارۂ اشاعت اردو حیدر آباد دکن سے جناب غلام دستگیر رشید صاحب نے جنوری ۱۹۴۳ء میں شائع کرایا تھا۔ اور جنھیں اب دوبارہ حذف و اضافہ کے ساتھ "سلطانِ ما محمدؐ" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

"سلطانِ ما محمدؐ" میں شامل سیرتی مقالات کا بڑا امتیاز جو اسے سیرت کی بیشتر کتابوں سے الگ کرتا

ہے اس کا سحر انگیز اسلوب ہے ، ایسا اسلوب جسے اسلوبِ ماجدی کہا جاسکتا ہے۔ اس اسلوب میں ایک ایسی چاشنی ، ایسی والہیت اور ایسی سپردگی ہے جو بہت کم سیرت نگاروں کو میسر آسکی۔ اس جوش و خروش سے مملو اسلوب کی مثال اس پہاڑی ندی کی سی ہے جو تھرکتی سرکتی اچھلتی اور سنبھلتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور جس میں سرجوشیدگی اور نغمہ زنی باہم آمیخت ہوگئی ہوں - اس اسلوب میں ایک ایسا خطیبانہ جوش ہے جسے منطق اور استدلال کے چھینٹوں نے معتدل اور متوازن بنایا ہے۔ ابھی پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے کہ ماجد پر ارتیاب کا ایک دردناک دور گزرا - وہ ایک مدت تک تشکیک والحاد کے ظلمات کدے میں بھٹکتے اور آبلہ پائی ، سراب گردی اور تشنہ دہنی کے عذاب سہتے رہے - لیکن یہ خلا کب تک رہتا۔ ماجد جان گئے تھے کہ اپنی اصل سے کٹ کر کس عذابِ الیم سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اس عذاب سے گزرے اور انہیں احساس ہوا کہ ایمان کی دولت ہی وہ زلالِ زندگی ہے جس سے تشنگیاں مٹتی ہیں اور خلا بھرتے ہیں۔ ماجد کے اسلوب سیرت نگاری میں جو والہیت اور جذبے کا وفور ہے اس کا سبب یہی ان کی عارضی سراب گردی ہے بہت کم تحریروں میں سرجوشیدگی اور حکمت ، دلیل اور تجزیہ کاری اور جلال و جمال کا وہ قران نظر آتا ہے جو ہمیں سیرت کی اس مختصر کتاب میں ملتا ہے۔ اس باب میں اگر کوئی اور کتاب اس کے پہلو بہ پہلو رکھی جاسکتی ہے تو وہ مناظر احسن گیلانی کی (چند اسلوبی ناہمواریوں سے قطع نظر) " النبی الخاتم " ہے۔

عرب کی سرزمین جو زیغ و ضلال اور گمراہی و گندگی میں گردن گردن دھنس چکی تھی اسے ایک بسیط ، اور معطر فضا میں لاکر انوارِ الٰہیہ اور حکمتِ بالغہ سے منور و متصف کر دینا ایک ایسا ہمہ گیر انقلاب ہے جس کی مثال دنیا کا بڑے سے بڑا انقلاب پیش نہیں کرسکتا۔ ایسے بڑے انقلاب اور ایسے عظیم داعئ انقلاب کے بیان کے لئے پھیکے اور بے جان لفظ کہاں کفایت کرسکتے ہیں۔ ماجد نے زندہ لفظوں اور زندہ اسلوب کا انتخاب کیا :

" ابولہب و ابوجہل اور ان کے سارے ہم نشینوں نے اس وقت دیکھا کہ بدبودار اور پُرعفونت کھاد ، گلی میں پڑی اور ان کی آنکھوں کے سامنے شاداب و خوش رنگ مہکتے ہوئے گلاب کے پھول میں تبدیل ہوگئی۔ حق کی قوت ہر تردید و تغلیط کے خطرے سے بے پروا ہے۔ زندہ معبود کے زندہ رسولؐ کے زندہ معجزہ کا جواب نہ اس وقت بن پڑا ، نہ آج حق کے جھٹلانے والوں ، محمدؐ کے دشمنوں اور ابولہب و ابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں سے کسی کے بس کی بات ہے۔" ——— " مردوں کی مسیحائی "

ماجد کے ان سیرتی مقالات کو مولانا محمد ہاشم فرنگی محلی نے نثری نعت کا نام دیا ہے اور واقعہ یہی ہے کہ نعت کا مقصدِ وحید بھی منعوت (رسول اللہؐ) سے ایک شدید قسم کی وابستگی پیدا کرنا ہے۔۔۔ یہی وابستگی کردار کی تعمیر کرتی ہے ___ اس میں ایک ہمہ جہت انقلاب لاتی ہے۔ ماجد کے ان مقالات کے سحر میں قاری ایک عجیب سرشاری اور سرمستی کی کیفیت لئے گرفتار ہوتا ہے اور جب مقالات پڑھ چکتا ہے تو اس کے دل میں حضورؐ کی محبت کا نقش گہرا ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ مضامین کسی نام نہاد ناطرفدار کے مضامین نہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی تحریریں ہیں جو رُواں رُواں عشقِ رسولؐ میں ڈوب چکا ہے:

"کچھ کم چودہ سو برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ تمدن کی نمائش گاہوں سے کوسوں دور، تہذیب کے سبزہ زاروں سے الگ، ایک ویران وبے رونق بستی میں، چلچلاتی دھوپ والے آسمان کے نیچے، خشک اور پتھریلی زمین کے اوپر، ایک شریف لیکن ان پڑھ اور بے زر خاندان میں، ایک بچہ عالمِ آب وگل میں آنکھیں کھولتا ہے، شفیق باپ کا سایہ پہلے ہی سے اٹھ چکا ہے، ماں بھی کچھ ہی روز بعد سفرِ آخرت اختیار کر لیتی ہیں۔ تربیت کے جو ظاہری قدرتی ذریعے ہیں وہ یوں گم ہو جاتے ہیں۔ بوڑھے دادا اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیتے ہیں لیکن بچہ کا بچپن ابھی ختم نہیں ہونے پاتا کہ وہ بھی ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں۔ گھر میں نہ نقد ہے نہ جائداد، نہ حکومت ہے نہ ریاست، خانہ ویرانی کا یہ عالم ہے کہ نہ ماں ہے نہ باپ، نہ دادا ہیں نہ دادی، نہ بھائی ہیں نہ بہن۔ تن تنہا، بے ساز و سامان، بے یار و مددگار۔ ایک نو عمر اللہ کا بندہ ہے جسے سہارا ہے تو اسی نظروں سے اوجھل مولا کا اور آسرا ہے تو اسی نگاہوں سے غائب مالک کا" ___ "یتیم کا راج"

زیرِ نظر کتاب کے مقالات "یتیم کا راج" اور "یتیم کی جیت" اپنے اسلوب اور عافیہ کے اعتبار سے اتنے اہم ہیں کہ انھیں تحریک سیرت لاہور کے ناظم قاضی عبدالمجید قریشی مرحوم نے الگ رسالوں کی شکل میں بھی شائع کیا۔ اسی طرح کتب خانہ انجمن ترقیٔ اردو جامع مسجد دہلی (ھندوستان) کے زیرِ اہتمام "یتیم کا راج" کا دوسرا ایڈیشن نومبر ۱۹۷۹ء میں مختصر کتابچے کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اسی کتاب کا ایک اور مقالہ "صابر رسول" حیدر آباد کی ایک انجمن نے الگ سے شائع کیا۔

"سلطانِ ما محمدؐ" کا ایک اور اہم مقالہ "میلادی روایات" ہے۔ اس مقالے میں ماجد صاحب نے اپنے پُرتاثیر اسلوب کی جوت جگاتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اللہ کے جتنے برگزیدہ بندوں اور بندیوں کی پیدائش قرآن میں مذکور ہوئی ہے، ان سب میں ایک امر مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی پیدائش کے

وقت یا قبل و بعد کچھ خوارق عادت کا ظہور ضرور ہوا ہے . . . . . "پھر اگر رسولوں کے سردار اور پیمبروں کے سرتاج کی ولادت کی بشارتیں فرشتوں نے پکار پکار کر دی ہوں۔ اگر اس آفتاب کے طلوع پر عالم ملکوت میں غلغلۂ شادمانی و مسرت برپا ہوا ہو۔ اگر اس نورِ مجسم کی والدہ ماجدہ کے لئے بعض انوارِ غیب مرئی ہو گئے ہوں، اگر اس خوش نصیب و قابلِ رشک خاتون کے شہود میں بعض لطائفِ ملکوت بے آشکار ہو گئے ہوں تو کیا کسی مسلمان کو اس پر حیرت ہونی چاہئے ؟"

ماجد صاحب نے اپنے اسی مقالے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی "مدارج النبوۃ" اور شاہ ولی اللہ کی "سرور المحزون" کا ذکر کرتے ہوئے ان دونوں میں شامل میلادی روایات کو مستند مانا ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے سرسید احمد خاں کا بھی یہی خیال تھا چنانچہ انھوں نے اپنے ۶۵ صفحات کے رسالے "جلاء القلوب بذکر المحبوب" میں انہی دو کتابوں کو ماخذ بنایا اور ان سے جا بجا استفادہ کیا۔ بعد کو انھوں نے ان ماخذات کے مندرجات کے بارے میں شکوک کا اظہار شروع کر دیا، خصوصاً "مدارج النبوۃ" میں انھیں ہزاروں لغو اور نامعتبر کہانیاں درج نظر آئیں۔ یہ سب ان کی "جدیدیت زدگی" کا "فیضان" تھا —— یہ جدیدیت یورپ سے آئی تھی، وہی یورپ جس سے بے طرح مرعوب ہونے والوں کے بارے میں شبلی نے بڑے پتے کی بات کہی تھی:

نکتۂ شرع بہ افسانہ برابر بہ نہی !
یورپ ار "گپ" زند آں نیز مسلّم باشد

ماجد نے تو صرف "مدارج النبوۃ" اور "سرور المحزون" کا ذکر کیا ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ خود اردو میں اس دور میں جو منظوم اور منثور میلاد نامے لکھے گئے ان میں ایسی روایات بکثرت ملتی ہیں۔ محمد باقر آگاہ، جو شاہ ولی اللہ کے معاصر تھے "ریاض السیر" میں حضورؐ کی ولادت کے باب میں لکھتے ہیں:

"آپ نے جیسا یہاں قدم رنجہ کیا، اپنے چہرے سے طلوعِ یک مہ کیا، دفع کی ظلمتِ کدورت، یہ کہ وہ سب کا سب بچھلائی دفتر تہہ کیا۔ فلک الافلاک سے نقطۂ مرکزِ خاک تک اور سطحِ عرشِ بریں سے تختِ فرش تک تمام تاریکی کا باقی نہ رہا۔ کیونکہ وہ ماہ میں کب یہ نور ہے اور بے کچھ یہ شان اور ہے کچھ ظہور۔ جتنے جن اور شیاطین تھے آسمان پر جانے سے باز آئے اور ستارے زمین سے ان سے نزدیک دکھائی دیتے تھے۔ گویا زمین پر بالکل اتیں حرم کے روشن ہوئی اور اک اہلِ فارس کے ہزار برس سے

جلتے تھے کرے اور اہلِ فارس مشک و عنبر اس میں ڈال کر پوجتے تھے، بجھ گئے، نور فزا شمعِ عرب کیا ہوئی، آتش فارس وہیں مردہ ہوئی۔"

اور یہی بات شاہ ولی اللہ نے لکھی ہے کہ:

"بمرد آتش فارس و مردہ بود پیش ازاں ہزار سال وخشک شد چشمۂ ساوہ۔"

واضح رہے کہ شبلی کی "سیرۃ النبی" میں بھی جہاں حضورؐ کی ولادتِ باسعادت کا ذکر آیا ہے، وہاں ایسی ہی خوارقِ عادت کا ذکر ہوا ہے جو مستند اور قابلِ یقین ہے۔ خود عربی میں موجود مولید میں ایسی روایات ملتی ہیں۔ عربی میں مولود شریف کی پہلی کتاب عمر بن حسن دحیہ کلبی نے لکھی جسے ابنِ خلکان نے "التنویر فی مولود سراج المنیر" لکھا ہے۔ چونکہ اسلام میں مولود کی مجالس کا رواج چھٹی صدی ہجری میں ہو چکا تھا اس لئے منظوم و منثور مولودوں کی تعداد یقیناً ہزاروں تک پہنچتی ہوگی۔ سینکڑوں کی تعداد میں تو صرف اردو میں مولود لکھے گئے۔ خود حالی نے جو مولود شریف لکھا اس میں انھوں نے وہ تمام روایات بیان کی ہیں جو سر سید وغیرہ کے نزدیک ضعیف قرار پا گئی تھیں مثلاً والدہ ماجدہ کے حمل کے وقت روشنی کا ظہور۔ ولادت کے وقت دنیا کا بقعۂ نور ہونا۔ بتوں کا منہ کے بل گرنا۔ ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگروں کا گرنا۔ آتش کدۂ فارس کا بجھنا وغیرہ۔ ماجد صاحب کے نزدیک یہ شہادتیں ان بزرگوں کی تھیں جو حدیث و سنت کی پرکھ رکھنے والے اور فنِ حدیث کے جاننے والے تھے۔ انھوں نے ان روایات کو رد نہیں کیا۔ لہٰذا ان روایات کو رد کر کے اپنی روشن خیالی کا ڈھنڈورا پیٹتے جانا کوئی اچھی بات نہیں۔

اس کتاب کا اہم ترین باب "سیرتِ نبوی اور علمائے فرنگ" ہے۔ اس میں ماجد صاحب نے بعض معروف مغربی سیرت نگاروں مثلاً جارج فنلے، ولیم میور اور کارلائل کی تلبیسات کا پردہ چاک کیا ہے۔ بات اصل میں یوں ہے کہ شاید مستشرقین کی ایک قابلِ لحاظ تعداد حضورِ اکرمؐ کی سیرت کی تحسین کی اہل ہی نہیں۔ ان کی مادی تربیت اور زہریلی عقل پرستی ایک خاص سطح اور ایک خاص مقام سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ ماجد صاحب کے نزدیک بعض مستشرقین بظاہر تو حضورؐ کے لائے ہوئے انقلاب کے قائل نظر آتے ہیں لیکن وہ حضورؐ کو صرف اور صرف ایک غیر معمولی انسان اور ایک عظیم مصلح و مقنن کے روپ میں دیکھتے ہیں اور انھیں مامور من اللہ اور

وحئِ الٰہی کے فیض یافتہ کے طور پر ماننے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتے۔ چنانچہ ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد کمزور عقیدے کے مسلمان کے نزدیک حضورؐ کی حیثیت بجائے اللہ کے سچے اور برگزیدہ نبی کے محض ایک مخلص و نیک نیت مصلحِ وقت کی رہ جاتی ہے۔ ماجد صاحب چونکہ خود ایک عرصہ تک ان دوست نما دشمن مستشرقین کے دجل و فریب کاری کا شکار رہ چکے تھے اس لئے وہ اس فریب کاری کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک حضور اکرمؐ کو اللہ کا برگزیدہ نبی سمجھنے کے بجائے انھیں صرف مصلح اور بطلِ اعظم سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے صوبے کے گورنر سے کہا جائے کہ حضور والا کے اختیارات کا کیا کہنا، آپ پٹواریوں سے بڑھ کر اختیارات رکھتے ہیں اور چپراسیوں سے بڑے حاکم ہیں۔

اصل میں حضور اکرمؐ کو محض ایک عظیم سیاسی لیڈر قرار دینے والوں میں کئی اہم نام آتے ہیں۔ والٹیئر نے اپنی کتاب میں حضورؐ کا مقابلہ کرامویل سے کیا ہے اور ان کے کارناموں کو انگلستان کے اس نجات دہندہ سے عظیم تر قرار دیا ہے۔ صرف مادی معجزات پر نظر رکھنے والے ایسے ہی کوتاہ بینوں کو پیر رومیؒ نے مشورہ دیا تھا کہ:

ع لفظ بگزاری سوئے معنی رَوی

مستشرقین میں سے بعض لوگوں نے ہمارے یہاں قبولِ عام پایا ہے۔ انھی میں ایک نام کارلائل کا بھی ہے جسے ہمارے بڑے بڑے علما اور سیرت نگاروں نے بھی ایک منصف مزاج مؤرخ کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ایسے بڑے لکھنے والوں میں سرسید اور شبلی بھی آتے ہیں جنھوں نے کارلائل کے خطبے "ہیرو ایز اے پرافٹ" کو کارلائل کی انصاف پسندی کی قوی برہان قرار دیا ہے لیکن ماجد صاحب کا موقف یہ ہے کہ اپنی تمام تر ظاہری انصاف پسندی کے باوصف اس کی تحریروں کی تہ میں وہی تعصب کارفرما ہے جو بالعموم مستشرقین کا خاصہ رہا ہے۔

ہمارا احساسِ کمتری تو اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ ہم مستشرقین کی منصف مزاجی کی دلیل بھی مستشرقین ہی کی تحریروں سے لاتے ہیں۔ اب چونکہ ہمارے لکھنے والوں کو فلپ۔ کے حتّی کے قبیل کے بظاہر "انصاف دوست" اور "ناطرفدار" مؤرخوں نے بتا دیا ہے کہ:

"کارلائل کی کتاب (ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ) میں مشکل سے کوئی ناخوشگوار فقرہ ہوگا۔ یہ کتاب اس لئے قابلِ تنقید ہو سکتی ہے کہ یہ غیر تنقیدی ہے ـــــ محمدؐ ایک سازشی مکار ہیں، جھوٹ

مجسمہ ہیں۔ ان کا مذہب محض انسانی نسخوں کا مجموعہ ہے ـــ اس قسم کی باتیں کارلائل کو کہاں گوارا نہیں۔ اس کا ہیرو (محمدؐ) واقعی ایک انسان تھا ـــ سچا انسان"۔

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ کارلائل بڑے انصاف پسند ہیں، بڑے حق شناس ہیں، لیکن ان اوراق میں آپ کارلائل جیسے لوگوں کو بھی ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکتے ہیں جو کھل کر نہیں بلکہ اندر ہی اندر زہر چکانی کے فن میں ماہر ہیں۔ ماجد صاحب نے ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو "صدق جدید" میں ایک مضمون "اسلام پر مستشرقین کی نظر کرم" لکھا تھا۔ یہ مضمون ماجد کے، مستشرقین کے سلسلے کے موقف، کی بڑی کامیابی سے وضاحت کرتا ہے:

"اسلامیات پر قلم اٹھانے والے مستشرقین کی ایک جماعت کا رویہ تو ہمیشہ سے معاندانہ، مخالفانہ اور متعصبانہ رہا ہے بلکہ بعض کی تحریریں تو کھلی ہوئی بدزبانی اور سب وشتم کی مثالیں ہیں، خصوصاً آج سے ڈیڑھ دو صدی قبل کی تحریریں[1]۔ رفتہ رفتہ لب ولہجہ کی تلخی وخشونت میں اصلاح ہوتی گئی اور اب ان کی تنقیدیں عموماً نرم وغیر دلآزار زبان میں ہونے لگی ہیں۔ لیکن جو لوگ مہذب وشیریں زبان لکھتے ہیں ان کے قلم سے بھی کبھی نہ کبھی کوئی ایسی بات نکل ہی جاتی ہے جو اسلام کے کسی عقیدہ کی ہادم یا اسے پڑھنے والے کی نظر میں مشکوک ومشتبہ بنا دینے والی ہو اور "ریسرچ" کے معنی ہی تو ان کے ہاں ٹھہر گئے ہیں مسلّمات ویقینیات میں شک وشبہ پیدا کرنا اور ان میں رخنے ڈالنا۔ گو یا بات کہی جاتے دھیمے اور خوشگوار لہجے میں لیکن اثر اس سے بھی پڑھنے والے پر بے یقینی اور تشکیک ہی کا پڑے۔ اور اس کی بنیاد ضروری نہیں کہ اسلام دشمنی ہی پر ہو۔ یقین کی جگہ بے یقینی، سکون کی جگہ مسلسل بے چینی اور اطمینان کی جگہ بے اطمینانی فرنگی ذہنیت کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے اور اس کا اظہار ان کے سارے ہی علمی و "تحقیقی" کاروبار میں ہو رہا ہے ـــ ہمارے نقطۂ نظر سے ایک معصیت و لعنت اور انکے زاویۂ نظر

---

[1] اصل میں ان تحریروں میں وہی عہدِ وسطیٰ کا یورپی تعصب کار فرما ہے جس کی تفصیل حتی نے (اپنے تعصبات کے باوجود) اپنی کتاب ISLAM AND THE WEST کے چوتھے باب ISLAM IN WESTERN LITERATURE میں دے دی ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحہ ۹۳

سے دلیلِ ترقی و ارتقائے عقل"۔

اور اب ایک آخری بات ، "مردوں کی مسیحائی" کے فاضل مرتب نے ماجد کے ان سیرتی مقالات میں بعض ایسے مضامین بھی شامل کر لئے تھے جو حضورؐ کی سیرت سے براہِ راست متعلق نہیں تھے ، یعنی "خطبۂ نکاح" ، "مسئلہ طلاق کتاب و سنت کی روشنی میں" ، "اعدائے رسول کی ہجو" اور "تقدیسِ رسولؐ"۔

زیرِ نظر ایڈیشن میں خطبۂ نکاح اس لئے شامل نہیں کیا گیا کہ سیرت سے براہِ راست غیر متعلق ہونے سے قطع نظر یہ محمد صدیق دریا بادی (مرحوم) کی مرتبہ "خطباتِ ماجد"[1] میں شامل ہو چکا ہے۔ یہ مولانا ماجد کا تیسرا خطبۂ نکاح تھا جو انھوں نے اپنی منجھلی صاحبزادی حمیرا خاتون کی تقریبِ عقد پر دیا۔

"مسئلہ طلاق"، "اعدائے رسول کی ہجو" اور "تقدیسِ رسولؐ" یہ تینوں مقالات ، کتاب کے مجموعی مزاج سے قطعی طور پر ہم آہنگ نہیں تھے لہٰذا انھیں بھی زیرِ نظر ایڈیشن میں شامل نہیں کیا گیا ان چاروں مقالات کی جگہ چار نئے مقالات شامل کئے جا رہے ہیں جو صدقِ جدید کے مختلف فائلوں سے لئے گئے ہیں۔ ان میں سے دو مقالات یعنی "ولادت باسعادت" اور "رحمت اللعالمین" ماجد صاحب کی ایک اہم تصنیف "نشریاتِ ماجد" میں بھی چھپ چکے ہیں۔

جناب سراج منیر اور جناب محمد مختار صاحب میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کا ادارہ مولانا ماجد کے ان اہم سیرتی مقالات کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ مجھ پر جناب عبدالقوی دریا بادی صاحب کا شکریہ بھی واجب ہے جن کی اجازت سے یہ مقالات اب "سلطانِ ما محمدؐ" کے نام سے شائع ہو رہے ہیں۔

ع اے سرورِ دیں نور ہے یکسر تری سیرت

تحسین فراقی

استاد شعبۂ اردو ، ایم ۔ اے ۔ او کالج لاہور

---

[1] خطباتِ ماجد یا ہدیۂ زوجین (مرتبہ محمد صدیق دریا بادی) ادارۂ انشائے ماجدی کلکتہ ، ۱۹۷۸ء ص ۱۱۲

[illegible]

سلطانِ ما محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آفتابِ شرع و دریائے یقیں
نُورِ عالم رحمۃ للعالمیں
خواجۂ کونین و سُلطانِ ہمہ
آفتابِ جان و ایمان ہمہ

——— خواجہ فریدالدین عطارؒ

سلطانِ مامحمد صلی اللہ علیہ وسلم

گمراہی کی سیاہ چادر

انسان زندہ بنایا گیا ہے' لیکن یہی زندہ کبھی مردہ بھی ہو جاتا ہے۔ دنیا روشن پیدا کی گئی ہے' لیکن یہی روشنی کبھی تاریکی میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ روئے زمین کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے ہادی و رہنما آئے اور گزر چکے' لیکن اب ایک مدت سے دنیا ان کی ہدایتوں سے محروم ہے[1]۔ بارش اپنے موسم میں زمین کو خوب سیراب کر چکی تھی' لیکن اب جلتی اور تپتی ہوئی زمین کے ہونٹوں پر پیاس سے خشکی کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ آخری نبی حضرت مسیحؑ کے زمانہ کو ساڑھے پانچ سو سال کی مدت گزر چکی ہے اور اب سطحِ زمین نورانیت کے فیض سے یکسر محروم ہے۔ دن کی روشنی چھپ چکی ہے اور عالمِ انسانیت پر رات کی سیاہی چھائی ہوئی ہے۔ کسی ایک ملک کی تخصیص نہیں' آفتاب کے طلوع ہونے کی جگہ 'مشرق' اور آفتاب کے غروب ہونے کی جگہ 'مغرب' سب گمراہی و سرگشتگی کی اسی سیاہ چادر میں لپٹے ہوئے ہیں[2]۔

---

[1] علی فترۃ من الرسل (مائدہ' ع ۲)

[2] یورپ اس زمانہ میں مذہبی' اخلاقی' تمدنی' سیاسی' ہر حیثیت سے جن گندگیوں میں مبتلا تھا' اس کی تفصیل اردو میں لیکی کی تاریخ "اخلاقِ یورپ" (مترجمہ عبدالماجد) کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ لیکی کے علاوہ ڈریپر' ڈل مین اور دوسرے بے شمار مصنفین میں سے جس جس نے بھی مسیحی قوموں کی تاریخ' پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں لکھی ہے' سب نے اسی داستان کو اپنے اپنے رنگ میں دہرایا ہے۔ ڈریپر کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ کلیسائے عیسوی کا شیرازہ پادریوں کے حُبِّ جاہ اور خباثتِ نفس کی وجہ سے پراگندہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بحر و بر، شرق و غرب، عرب و عجم سب کی روحانی زندگی موت سے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (روم ع ۵) تبدیل ہو چکی ہے، اور کائنات انسانی کی ساری فضا شقاوت و نفس پرستی، بدی و بدکاری، شرارت و نفاق کے گہرے بادلوں سے سیاہ ہو رہی ہے۔

محروم عرب

یہ حال سارے عالم انسانیت کا ہے لیکن براعظم ایشیا کے جنوب و مغرب کا وہ حصہ، جو عرب کے نام سے موسوم ہے اس عموم میں ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ سرزمین جس طرح مادی حیثیت

(گزشتہ سے پیوستہ) ہو رہا تھا، اجتہادات کو شان اجماع بخشنے کے بہانے سے اکثر کونسلوں کے اجلاس منعقد ہوتے تھے لیکن انعقاد کا اصل مقصد پوشیدہ رکھا جاتا تھا، اسا اوقات ان کونسلوں میں جبر، ارتشا، و بد دیانتی کا سماں نظر آتا تھا۔ مغرب میں بطریق کا عہدہ دولت و تمول، عیش و عشرت اور شکوہ و طمطراق کی ایسی نیت آزما ترغیبات پیش کرتا تھا کہ اس عہدہ پر کسی پادری کے نامزد ہوتے وقت خوں ریز ہنگاموں کا واقع ہونا سادات ہو گیا تھا .... یہ تمام فرقے اگرچہ عقائد میں ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن ایک بات قدر مشترک کے طور پر ایسی بھی تھی، جس پر ان سب کا اتفاق تھا، اور وہ بات تھی، آپس کی باہمی نفرت و عداوت، جس نے ہر فرقہ کو دوسرے فرقہ کی جان کا دشمن بنا رکھا تھا۔" (معرکہ مذہب و سائنس ص ۱۵۰، مترجمہ مولوی ظفر علی خاں صاحب)

لیکی کے بیانات کا نمونہ بھی قابل ملاحظہ ہے: "کلیسا کی اشاعت بربریوں کے درمیان ہو رہی تھی جنھیں علم و تمدن سے کوئی مناسبت نہ تھا۔ ظلم و جبر، مکر و فریب، آوارگی و اوباشی کی وہ گرم بازاری تھی کہ آدمی ان کی داستانیں پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے ... ملکہ فریڈیگونڈ و ملکہ برنہاٹ کا نمبر اپنی خوں آشامیوں اور ہوسناکیوں کے لحاظ سے ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا۔ اور خیر یہ دونوں تو ملکہ تھیں، ہر طبقہ نے فسق و فجور کاری کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا .... غرض اس زمانہ کی تاریخ کے جس کسی صفحہ کو ہم کھولتے ہیں ہر جگہ ظلم و شقاوت، سفاکی و فحش، بدچلنی و شہوت پرستی کے مناظر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔"

(تاریخ اخلاق یورپ، جلد ۲ ص ۱۵۰ مترجمہ عبدالماجد)

سے بلب ہے شاید اسی طرح اب تک فطرت کی روحانی بارشوں اور بخششوں سے بھی محروم ہے اس کی تباہ کاریاں اور تیرہ بختیاں سارے عالم کے لئے ایک نمونۂ عبرت ہیں۔ بیمار گل دنیا ہے لیکن عرب کا مریض، دق میں مبتلا ہے۔ خشک سالی سب کہیں ہے لیکن یہاں قحط شدید پڑا ہوا ہے۔ اس کی اخلاقی پستی حد سے گزر چکی ہے، اس کی روحانی بیماریاں تقریباً لاعلاج ہو چکی ہیں، اس کی سرکشی و تباہ کاری، خود پرستی، اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ (توبہ، ع ۱۲) خدا فراموشی، عقائد کی خرابی اور اعمال کی ابتری نے اسے اس لائق بھی نہیں رکھا ہے کہ کوئی بشری کوشش اصلاح حال میں کامیاب ہو سکے۔ رشد و ہدایت، پاکبازی و پاکیزہ خوئی، حسن عمل و نیک کرداری کا کیا ذکر ہے۔ اب تو اس قوم کی ساری زندگی کا خلاصہ صرف ایک لفظ گمراہی یا ضلالت میں بیان کیا جا سکتا ہے اور ضلالت بھی کیسی؟

وان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبین (جمعہ، ع ۱)

تاویل و توجیہہ کی گنجائش سے ماوراً بالکل واضح و صریح! ساری اصلاحوں کی بنیاد قلب کی صلاحیت پر ہوتی ہے۔ قلب میں جب تک نرمی و گداز باقی ہے، اس وقت تک اصلاح حال کی امید قائم کی جا سکتی ہے، لیکن ان بدنصیبوں کی نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ان کے سینوں میں انسانیت کی نرمی اور قلبوں میں آدمیت کے چشمے خشک ہو چکے ہیں۔

فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً (بقرہ)

اور اس کے بجائے دلوں میں پتھروں کی سی سختی، بلکہ پتھروں سے بھی بڑھ کر سختی پیدا ہو گئی ہے اور قبول حق کے گویا سارے دروازے انھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے اوپر بند کر لئے ہیں۔ بدکاریوں اور بدکرداریوں میں مسلسل مبتلا رہتے رہتے ان کے دل و دماغ، ان کی عقل و ذہن مسخ ہو چکے ہیں، حق و باطل، نیک و بد، نور و ظلمت کا فرق ان کی نظروں سے مٹ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (فرقان) ـــــ چکا ہے۔ جانوروں کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، بلکہ اپنی کم فہمی، بے بصری اور تنگ نظری میں جانوروں سے بھی کچھ آگے نکل چکے ہیں!

مؤرخین کا بیان

یہ تصریحات اس کتاب پاک کی ہیں جو ہر قسم کے مبالغہ وافراط سے بالا تر ہے اور جس کا ایک ایک حرف، صداقت وحقیقت کے اونچے سے اونچے معیار کا نمونہ ہے۔ تاہم بہتر ہوگا کہ اس زمانہ کے "روشن خیال" اپنی تشفی کے لئے "محققینِ فن" و "ماہرینِ تاریخ" کے بیانات پر بھی ایک سرسری نظر کرتے چلیں:

"دورِ جاہلیت کی سترہ سو جنگیں مشہور چلی آتی ہیں۔ یہ لڑائیاں اس شدتِ عناد کے ساتھ قائم رہتی تھیں جو خانہ جنگیوں کی خصوصیت ہے۔ پشتہا پشت کے کسی بھولے بسرے واقعہ کا نشر یا نظم میں تذکرہ عداوتوں کے خرمن میں چنگاری بن جانے کے لئے بالکل کافی ہوتا تھا۔ پھر ہر فرد اگر نہیں، تو کم از کم ہر خاندان تو ضرور اپنے تئیں ہر فیصلہ اور انتقام کا پورا مجاز سمجھتا تھا ــــ عورتوں اور داڑھیوں کی توہین بات بات میں نکل آتی تھی۔ کسی نے ذرا بھی بے جا شوخی کی، کسی نے ذرا بھی ہتک آمیز بات کہی، بس پھر مجرم کے خون کے بغیر جنگ نہیں فرد ہو سکتی، اور کینہ بھی اس بلا کا کہ مہینوں بلکہ برسوں تک انتقام کا سلسلہ نہیں ختم ہوتا؟"

یہ الفاظ مشہور مؤرخ روما، ایڈورڈ گبن کے ہیں۔

(تاریخ زوال مملکت روما، باب ۵۰)

"مکہ اور سارے جزیرہ نمائے عرب پر ایک بے اندازہ مدت سے روحانی موت طاری چلی آرہی تھی۔ یہودیت، مسیحیت اور عقلیت کا دماغِ عرب پر کل اتنا ہی اثر ہوا تھا کہ جیسے ایک پُرسکون جھیل کی سطح پر کچھ ہلکی موجیں لہرانے لگیں اور نیچے بدستور سکون قائم رہے۔ یہ لوگ وہم پرستی، شقاوت و بدکاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایک عام دستور یہ تھا کہ بڑے بیٹے کو باپ کی جائداد کے ساتھ اس کی بیویاں بھی ترکہ میں مل جاتی تھیں۔ جذبۂ غرور، نیز افلاس کی بنا پر دختر کشی کی رسم بھی ان کے ہاں جاری تھی۔ ان کا مذہب شدید بت پرستی تھا ــــ حشر و جزا کے عقیدہ سے گویا بالکل نا آشنا تھے۔"

محمدکی بعثت سے قبل عربوں میں مذہبی اصلاح کا ہو جانا ایسا ہی بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا کہ جیسا ان کا ملکی وسیاسی حیثیت سے ایک قوم بن جانا۔ دین عرب کی بنیاد بہت گہری بت پرستی پر تھی جس کی اصلاح کی مصری وشامی مسیحیت کی جانب سے صدیوں سے کوشش ہو رہی تھی اور ہمیشہ ناکامی ہی رہتی تھی۔"

یہ اعترافات سرولیم میور کو کرنے پڑے ہیں۔

(لائف آف محمدؐ، باب ۱۷، نیز مقدمۃ الکتاب)

"انسان کی جان لے لینا سرے سے کوئی اخلاقی جرم ہی نہ تھا۔ نہ قتل اتفاقی اور قتل عمد کے درمیان کوئی فرق کیا جاتا تھا۔۔۔ قتل کا انتقام نہ لینا باعث توہین تھا۔۔۔ شہوت پرستی و بے عصمتی کی گرم بازاری تھی۔ دوسرے کے مال کی حفاظت پاس وفا اور عزت کے جذبات کی عرب جاہلیت میں کچھ قدر نہ تھی۔"

یہ شہادت اس مشہور دشمن اسلام کو دینی پڑی، جسے دنیا آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیس کے نام سے پکارتی ہے۔ (محمدؐ بسلسلہ سوانح مشاہیر اقوام، باب اول)

"مکہ کے مادی تجارتی شہر میں غرض پرستی اور سود خوری کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کے وقت گزاری کے لئے عورتیں تھیں، شراب تھی، جوا تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون جاری تھا۔ بیوہ عورتوں، یتیموں اور کمزوروں کا کوئی حق نہ تھا۔ اللہ کے نام سے اہل مکہ ضرور واقف ہو گئے تھے لیکن اپنی عملی زندگی میں انھوں نے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا، اس لئے کہ خالق کے معنی ان کے نزدیک حاکم ومالک کے نہ تھے۔ اپنے نفع ونقصان اور مشرکانہ رسوم کے لئے ان کے سر ہر صنف موجودات کے آگے جھکے ہوئے تھے۔"

یہ تحقیقات، لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے مشہور تازہ ماہر عربیات واسلامیات" پروفیسر ہرگرونج کی ہے، جو امریکہ کی یونیورسٹیوں کے سامنے مخصوص اسی موضوع پر تقریریں کرنے کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ (محمدزم، باب اول)

خلاصہ بیان کر ایک روشن خیال مسلمان کی زبان سے، جنھوں نے اپنی قوم کے روشن خیالوں

ہی کے لئے سیرت محمدی پر ایک ضخیم کتاب تالیف فرمائی ہے، سن لینا چاہئے:

"بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی۔ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی۔ حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی۔ ازدواج کی کوئی حد نہ تھی۔ قمار بازی، شراب خوری، زناکاری کا رواج عام تھا۔ بے حیائی کی یہ حالت تھی کہ سب سے بڑا نامور شاعر امراء القیس، جو شاہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا واقعہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے، اور یہ قصیدہ در کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کے پیٹ چاک کر دینا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا۔"

(سیرۃ النبیؐ مولانا شبلی، جلد اول، صفحہ ۱۲)

فضا اور بعثت

یہ فضا ہے، جس میں ایک بے کس و بے یار، یتیم اور اَن پڑھ بچہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ کارساز فطرت کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ اسی بے کس و ناتواں کے ذریعہ سے، ایک قبیلہ کی نہیں ایک قوم کی نہیں، ایک ملک کی نہیں، سارے عالم بلکہ سارے عالموں ﴿لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ کی اصلاح کا کام لیا جائے، اور اسے سارے جہانوں کی جانب یہ پیام دے کر بھیجا جائے کہ فطرت سے بغاوت کرتے رہنے والوں کا بالآخر کیا انجام ہونے والا ہے۔ پیامبر اپنا پیام پہنچاتا ہے، اور اس کے گرد و پیش کی ساری شیطانی قوتیں دولت و قوت کے سایہ میں جمع ہو کر اس کی مخالفت اور عداوت پر کمربستہ ہو جاتی ہیں۔ اس عالی ظرف کا ظرف، سالہا سال تک، ہر قسم کی تکلیف و توہین، اذیت و رسوائی کے مقابلہ میں سپر بنا رہتا ہے، تاآنکہ مخالفین کے حوصلے اور بڑھ جاتے ہیں ... اور کھلم کھلا یہ مطالبہ ہونے لگتا ہے کہ اگر حق کی قوت و نصرت اس کے ساتھ ہے تو آخر حق و باطل، نور و ظلمت میں کھلا ہوا فرق، فرقان[1] اس پر کیوں نہیں نازل کر دیا جاتا: جواب ملتا ہے کہ فرقان

---

[1] الفرقان ابلغ من الفرق لانہ یستعمل فی الفرق من الحق والباطل (راغب)

تو شروع ہی سے اس کے ہمراہ ہے — قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ — حق و باطل کی راہیں تو آغاز ہی سے الگ الگ ہیں، البتہ اسے بے بصرو! تم جو سوا مادی فتح و فیروزمندی کے کسی اور فرقان کو محسوس کرنے سے معذور ہو' اور دن رات اس قسم کے واہی تباہی خیالات اور بچوں کے سے مطالبات پیش کرتے رہتے ہو کہ یہ پیمبر تو ہم ہی انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا — چلتا پھرتا ہے' اس کے ساتھ انسانی قویٰ سے ماورا کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا' یا اسے فکر معاش سے بے نیاز کرنے اور عیش سے زندگی گزارنے کو غیب سے کوئی خزانہ اس کے پاس کیوں نہیں اتر آتا' یا اسے جنت کے موعودہ اور مفروضہ باغوں کی طرح کوئی باغ کیوں نہیں نصیب ہو جاتا! سو اپنی ان خام خیالیوں اور بے مغزیوں کے جواب میں تیار ہو جاؤ۔ اسی دنیا میں فرقان اتر کر رہے گا' اور ایسا فرقان' جسے تمہارے مادی حواس بھی محسوس کر کے رہیں۔ تم ایک غیبی قوت' فرشتے کے نزول کا مطالبہ کر رہے ہو' اس نبیؐ کا مرتبہ تو کہیں بڑھ چڑھ کر ہے' اس کے غلاموں پر ان غیبی قوتوں کا نزول ہوگا جن کی توجیہ و تاویل' تاویل و تعلیل میں تمہارے بڑے سے بڑے فلسفیوں اور حکیموں' عاقلوں اور داناؤں کی دانائی و زیرکی عاجز رہ جائے گی — تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ — اور آج تم ایک باغ کو انتہائی نعمت سمجھ رہے ہو' کل دیکھنا کہ اسی بندہ کے غلام' ان غلاموں کے غلام' قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے' روم و ایران کی زبردست شہنشاہیاں زیر و زبر کر دیں گے اور مصر اور افغانستان' عراق و ایران' ترکی و ھندوستان کے چمن و گلشن' سبزہ زار و گلستان ان کے قدموں سے پامال ہو کر رہیں گے۔

ہدایت کی روشنی

کیسی بابرکت' کس کثرت سے برکت نازل کرنے والی' کس طرح دائمی و مسلسل برکت نازل کرنے والی' وہ پاک ذات ہے جس نے تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ

جَعَلَ فِیۡھَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِیۡرًا — آسمان میں ستارے[1] اور روشن آفتاب[2] اور اجالا کرنے والا چاند بنادیا۔ جس پروردگار نے مادی رہنمائی و روشنی کے لئے سب کچھ سامان مہیا کردیئے ہیں کیا وہ اپنے بندوں کو روحانی روشنی و رہنمائی کے سامان سے محروم رکھے گا؟ آفتاب اسی وقت طلوع ہوتا ہے جب پہلے تاریکی اچھی طرح چھا چکی ہوتی ہے۔ دنیا کی روحانی تاریکی اب اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے، وقت آگیا ہے کہ سراج منیر، تمام عالموں کے روشن کردینے والے چراغ کا طلوع ہو۔ آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی تڑپ سے چاند بھی جگمگا اٹھتا ہے، اور خود روشن ہوکر دوسروں کو روشن کردیتا ہے۔ اس آفتاب روحانی کی ضیا باری بھی اسی شدت و قوت کی ہوگی، اس کی شعاعیں دوسروں کو منور کرکے انھیں خود چاند کی طرح نورانی و نورافگن بنا دیں گی۔ پھر یہ اسی کارساز مطلق کا بنایا ہوا عام قانون فطرت ہے کہ رات اور وَھُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الَّیۡلَ وَالنَّھَارَ خِلۡفَۃً لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُکُوۡرًا دن ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں اور جن کے دلوں میں نصیحت قبول کرنے اور بندۂ شکرگزار بننے کی صلاحیت ہے، ان کے درس کے لئے یہ قانون مادی بالکل کافی ہے جب عالم جسم و مادہ میں ہر رات کے بعد دن کا آنا لازمی ہے، تو کیا کائنات جان و روح میں ہمیشہ تاریکی ہی چھائی ہوئی رہے گی؟ نفس پرستی و خدا فراموشی کی طویل شب دیجور کا ختم ہوکر رہنا لازمی تھا، وہ ختم ہوئی اور روحانیت کا آفتاب، اصلاح و ہدایت کا سورج طلوع ہوگیا۔ زندہ فرقان اس زندہ فرقان کی عظمت کو دیکھو، اس نے دیکھتے ہی دیکھتے تمہاری آنکھوں کے سامنے، اخلاق کی دنیا میں کیسا کیسا انقلاب پیدا کردیا۔ تم اس کے پیام میں طرح طرح کی حجتیں نکالتے ہو، سرے سے رحمٰن ہی کے وجود میں شک کررہے ہو اور ڈھٹائی سے پوچھتے ہو، کہ وہ الرحمٰن؟ سو اپنے اس ان دیکھے رحمٰن کی شانِ رحمت کو دیکھو، اس کی برکات رحمانیت کا مشاہدہ کرو کہ تمہاری ہی بنجر سرزمین ہے، تمہاری ہی مردہ قوم ہے، تمہارے ہی

---

[1] عن قتادہ، قال البروج النجوم (ابن جریر)

[2] عن قتادہ قال السراج الشمس (")

گرد و پیش کیسے کیسے بندگان رحمٰن پیدا ہو گئے ہیں، جو لوگوں سے بات بات پر وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ لڑنا، بلا وجہ الجھنا تو الگ رہا، صدیوں کی اس عادت اور پشتہا پشت کی اس خصلت کو چھوڑ کر اب اس قدر خاکسار و مسکین ہو گئے ہیں کہ ہاتھ پیر کی زیادتیوں اور بات چیت کی سختیوں کا ذکر نہیں، ان کی رفتار تک ان کی فروتنی و حلم پر گواہی دے رہی ہے؟ اور از خود تو اب کسی سے کیا چھیڑ کریں گے جب دوسرے اپنی نادانی و سفاہت سے اپنی شرارت و خباثت سے انہیں چھیڑتے ہیں، ان کی دل آزاری کے لئے ان پر اعتراضات کرتے ہیں تو اس کے معاوضہ میں بھی ان کی جبینِ تحمل پر شکن نہیں پڑنے پاتی، بلکہ حلم و آشتی، صلح و نرمی کے لہجہ میں ان سے اپنی سلامتی چاہتے، یا ان کے حق میں سلامتی کی دعا کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ساری ساری رات شراب خوری، ناچ رنگ اور بے حیائی کے دوسرے مشغلوں میں کاٹ کر صبح کر دیتے تھے، پر آج وہی خدائے رحمٰن کے بندے ہیں، وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا جو یہی نہیں کہ اپنے ان گندے مشغلوں سے یکسر تائب ہو چکے ہیں، بلکہ اب ان کی پوری پوری راتیں نماز و عبادت کی، دعا و قرآن خوانی کی، اور تہجد کے سجود و قیام کی نذر ہونے لگی ہیں۔ اور کچھ یہ نہیں کہ یہ کسی کے ڈر اور دباؤ سے کسی کی مروت میں، یا ریا و نمائش کی غرض سے کر رہے ہیں بلکہ قانون پاداشِ عمل کی ہیبت ان کے دلوں پر طاری ہو چکی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔۔۔۔ ہر بدی کے نتیجۂ بد کا خوف ان پر غالب آچکا ہے، اور آخری سزا گاہ دوزخ کی سختیاں ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتیں، اس لئے بکمال خلوص و خضوع، اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ ان سے انہیں محفوظ رکھے، اور جس پر اس قدر ہیبت الٰہی غالب ہو گی، کہ وہ لازمی طور پر اپنی زندگی کے ہر ہر جزئیہ میں نیکی و نیک کرداری، تقویٰ و حسن عمل کی ٹوہ میں برابر لگا رہے گا۔ پس یہ نیک اور برگزیدہ بندے وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔۔۔۔ یہی محض حقوق اللہ کی ادائی میں مستعد نہیں، بلکہ حقوق العباد کے ادا کرنے میں بھی ویسے ہی محتاط و ذوق شناس ہیں۔ چنانچہ خرچ کے معاملہ

میں، یہ گناہوں میں خرچ کرنے سے رکے رہتے ہیں، عیاشی میں یہ نہیں خرچ کرتے، شراب خوری میں یہ پیسہ برباد نہیں کرتے، نام و نمود کے لئے یہ اپنی تھیلیاں نہیں کھولتے، اور جب طاعت میں خرچ کرنے کا وقت آتا ہے، جب غریبوں اور بے کسوں کی امداد کا وقت آتا ہے، جب اللہ کے نام پر پیسہ لگانے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس وقت ان کا ہاتھ نہیں رکتا۔ اس وقت یہی سب سے بڑھ کر خرچ کرنے والے نکلتے ہیں، اور اس طرح ان کے مصارف، اسراف و بخل، دونوں برائیوں سے بچ کر ٹھیک اپنے صحیح موقع اعتدال پر ہیں۔

حکمائے قدیم نے کبائر معاصی کو انسان کی تین قوتوں کا نتیجہ بتایا تھا۔

۱۔ قوتِ واہمہ

۲۔ قوت غضبیہ

۳۔ قوت شہویہ

اور ان تینوں کے نتائج شرک، قتل و زناکاری کی صورتوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ حکمائے حال کی تحقیق میں نفس انسانی کی تحلیل، عقل، ارادہ و جذبات کی عناصر ثلثہ میں کی گئی ہے۔ اور ان تینوں میں جب اختلال و بدنظمی پیدا ہوگی تو اہم گناہوں کی یہی تین صورتیں نمایاں ہوں گی۔ انتہائی بدعقلی، نافہمی و جہالت کا نتیجہ شرک ہے..... قوتِ ارادی کا بے قابو ہو جانا، قتل و ہلاکت پہ ختم ہوتا ہے..... جذبات پر قابو نہ رکھنے کی آخری صورت زناکاری ہے۔ نسلِ انسانی جب کبھی اور جہاں کہیں بھی تباہ ہوتی ہے انہی معاصی میں مبتلا ہو کر تباہ ہوتی ہے۔ عرب جاہلیت، موجودہ جاہلین فرنگ کی طرح، خصوصیت کے ساتھ انہی بلاؤں میں مبتلا تھے

اعجاز یا انقلاب

"زندہ فرقان" کا اعجاز یہ تھا کہ اس زہریلی فضا، اس وبائی ماحول میں بھی اپنے مرید، بندگانِ رحمن کو ان وباؤں کے اثرات سے بالکل محفوظ کر دیا، کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نہ خدا کے ساتھ.....

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا

____ کسی اور معبود کو پکارتے ہیں نہ ناحق کسی کو قتل کرتے ہیں اور نہ زنا کرتے ہیں، اور جانتے رہتے ہیں کہ ان بداعمالیوں میں پڑنے والے اپنے کیفرِ کردار کو پوری طرح پہنچ کر رہیں گے۔ البتہ ان بداعمالیوں کے بعد جس نے انھیں برا سمجھ کر ترک کر دیا، اور نیکی کے راستہ کو پہچان لیا، اور پھر اسی راہ پر چلا بھی، سو خدائے غفور و رحیم خواہ مخواہ تکلیف کسی کو نہیں دیتا، وہ انکی موجودہ نیکیوں سے ان کی پچھلی برائیوں کو محو کر دے گا۔ اور ایسا ہونا تو اس کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے عین مطابق ہے، اس لئے کہ جس کسی نے بدی کو بد سمجھ کر وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا .... ترک کر دیا یا بالفاظ دیگر اس سے توبہ کر لی، اور اس کے بعد نیک عمل کرنے لگا تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس نے شیطان سے اپنی دوستی قطع کر کے، اللہ سے اپنا رشتہ جوڑ لیا، اور ٹیڑھے راستہ کو چھوڑ کر سیدھے راستہ پر پڑ گیا۔

جھوٹ اور لغو سے بچاؤ

اب تک ان کی زندگیوں کا سر رشتہ جھوٹ اور ناراستی، نمود و نمائش، ریا اور بناوٹ کے دامن سے وابستہ تھا، آج یہ دیکھتے دیکھتے اتنے پاک و صاف ہو گئے ہیں کہ خود جھوٹ بولنا وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا .... اور جھوٹی کارروائیوں میں شریک ہونا تو درکنار، جھوٹی زندگی رکھنے والوں کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔ جھوٹ اور تصنع ان کے شہود میں سرے سے آتا ہی نہیں، اور اگر محض اتفاق سے کسی ایسے مجمع میں پھنس جاتے ہیں جو کسی لغو و لایعنی مشغلہ میں مبتلا ہوتا ہے تو یہی نہیں کہ ان کے پاک نفوس ان شیطانی ترغیبات کی جانب سے بے رغبت رہتے ہیں بلکہ ان کے شیوۂ کریمانہ اور روشِ جداگانہ کو دیکھ کر خود وہ جماعت متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ زمانہ گزر گیا جب ان کے سامنے اللہ کی وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا .... نشانیاں، اس کی قدرت و عظمت کی نشانیاں گزرتی

رہتی تھیں اور یہ بہرے اور اندھے بنے ان کی طرف سے غافل اور بے خبر رہتے تھے۔ اب انکے کان کھل گئے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت روشن ہو چکی ہے۔ اب دنیا ان کے لئے ایک تماشا گاہ نہیں بلکہ دار العمل ہے۔ اب یہ نیکی و بدی کے قانون کو، عمل و جزائے عمل کے اصول کو، رب رحمٰن و رحیم کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ خود ان کی زندگیاں تو اخلاقی بیماریوں کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکیں۔ اس منزل سے گزرنے کے بعد قدرتاً اب ان کے دل میں یہ تمنا غالب ہے اور یہ اسی کی دعائیں کرتے رہتے ہیں، ان کے قریب ترین تعلق..... وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا..... رکھنے والے، ان کی بیویاں اور ان کی اولادیں، ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائیں، خود انہی کے رنگ میں رنگ جائیں، ان کی زندگیاں بھی انہی کے نمونہ پر ڈھل جائیں اور دوسروں کو راہ راست دکھانے کا جوش انہیں اس درجہ بیتاب کئے ہوئے ہے کہ محض اپنی زندگی کے سدھارنے پر قانع نہیں بلکہ دوسرے متقیوں کے لئے اپنے زندگی کو بطور نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں! اللہ اکبر! کمال روحانیت کی ترقی کو دیکھنا یہی نہیں کہ خود اچھے بن گئے، یہی نہیں کہ دوسرے اچھوں کے ساتھ ہو گئے بلکہ اس مرتبہ کی تمنا اور طلب کہ دوسرے پاکوں اور اچھوں کی پیشوائی اور امامت حاصل ہو جائے جس کو سارے متقی مل کر اپنا امام و مقتدیٰ تسلیم کریں، اس کے مرتبۂ کمال، اس کے ارتقاء روحانیت کا کچھ ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی جو دوسرے کاملوں کے لئے نمونہ کا کام دے سکے، خود کس درجہ کامل ہوگی؟

خزاں اور بہار

زمین خشک اور پیاسی پڑی ہوتی ہے، بارش کے فیض سے افسردہ چمن لہلہانے لگتا ہے، مردہ کھیتی میں جان پڑ جاتی ہے، سویا ہوا سبزہ جاگ اٹھتا ہے۔ باغ سنسان پڑا ہوتا ہے، پتیاں مرجھا مرجھا کر گر چکتی ہیں۔ بہار کی ہوا چلتے ہی نئی اور ہری پتیاں نکل آتی ہیں اور اجڑا ہوا باغ پھر سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ عالم پر شب کی سیاہی چھائی ہوتی ہے ہر شے تاریکی

میں گم ہوتی ہے۔ صبح کے طلوع ہوتے ہی ہر طرف اجالا پھیل جاتا ہے اور ہر ذرہ روشن ہونے لگتا ہے ایک پاک روح دنیا میں اصلاح و تزکیہ کے لئے آتی ہے اور اپنے فیضِ صحبت سے بہت سے اندھوں کو بینا' بہت سے بیماروں کو تندرست اور بہت سے مُردوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ کارخانۂ فطرت میں اس قانونِ فطرت کی نظیریں برابر ملتی رہتی ہیں۔

مُردوں کی مسیحائی

لیکن دنیا میں یہ انقلابِ روحانی پیدا کر دینا کہ کل تک جو رہزن تھے' وہ آج اچھے رہرو ہی نہیں بلکہ بہترین رہبر بھی ہو جائیں' کل تک جن کی زندگی فسق و فجور کی نذر تھی' آج وہ اتنے بلند و مقدس مرتبہ پر پہنچ جائیں کہ خود صداقت و پاکیزگی کو ان کے انتساب سے شرف ہو جائے' کل تک جو مُردہ تھے' وہ آج زندہ ہی نہیں بلکہ دوسروں کو زندہ کر دینے والے بن جائیں ایسے آفتاب کا طلوع جو ہر ذرہ کو آفتاب بنا دے' ایسے مسیح کا نزول جو مُردہ کو مسیح بنا دے۔ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بجز سرورِ عالمؐ کے صحابیوں' بجز محمدؐ کے غلاموں کے' اور کہیں بھی مل سکتی ہے؟

نادانوں کا قول ہے کہ خاتم النبیینؐ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا' حالانکہ یہ پاک زندگی شروع سے آخر تک خود ایک معجزہ تھی اور اس کا کوئی جزئیہ ایسا نہ تھا جو اپنے اندر ایک اعجازی رنگ نہ رکھتا ہو۔

اس "زندہ فرقان" کے ان زندہ معجزوں کے ہوتے ہوئے کشتیٔ نوحؑ' گلزارِ خلیلؑ' عصائے موسٰیؑ' تختِ سلیمانؑ' حسنِ یوسفؑ' دمِ عیسٰیؑ' کسی محدود' وقتی و مقامی معجزہ کی کچھ بھی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی نہ اُس وقت راز تھی نہ آج راز ہے۔ ابولہب اور ابوجہل اور ان کے سارے ہم نشینوں نے اُس وقت دیکھا کہ بدبودار اور پُرعفونت کھاد' گلے میں پڑی' اور ان کی آنکھوں کے سامنے شاداب و خوش رنگ مہکتے ہوئے گلاب کے پھول میں تبدیل ہو گئی' حق کی قوت ہر تردید و تغلیط کے خطرے سے بے پروا ہے' زندہ معبود کے زندہ

رسولؐ کا زندہ معجزہ کا جواب نہ اُس وقت بن پڑا' نہ آج حق کے جھٹلانے والوں' محمدؐ کے دشمنوں' اور ابولہب و ابوجہل کے موجودہ جانشینوں میں سے کسی کے بس کی بات ہے.

اللہ مراتب بلند کرے' اکبر الہ آبادی کے' سارے مضامینِ نعت کا عطر ایک شعر میں کھینچ کے رکھ دیا ہے ؎

خود نہ تھے جو راہ پر' اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

یتیم کا راج

وأبيض يستسقى الغمام بوجهه
ثمال اليتامى عصمة للأرامل

——— حضرت ابو طالب

وہ روشن اور تابناک چہرے والے جن کے صدقے میں بادلوں سے پانی مانگا جائے۔ وہ یتیموں کے والی اور بیواؤں کی جائے پناہ ہیں

یتیم کا راج

تمدّن کی نمائش گاہوں سے دُور

کچھ کم چودہ سو برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ تمدن کی نمائش گاہوں سے کوسوں دور تہذیب کے سبزہ زاروں سے الگ، ایک ویران و بے رونق بستی میں، چلچلاتی دھوپ والے آسمان کے نیچے، خشک اور پتھریلی سرزمین کے اوپر، ایک شریف لیکن اُن پڑھ اور بے زر خاندان میں، ایک بچہ عالمِ آب و گل میں آنکھیں کھولتا ہے۔

دعوے کی دلیل، صرف خدا کا سہارا

شفیق باپ کا سایہ پہلے ہی سے اٹھ چکتا ہے۔ ماں بھی کچھ ہی روز بعد سفرِ آخرت اختیار کرلیتی ہیں۔ تربیت کے جو ظاہری قدرتی ذریعے ہیں، یوں گم ہوجاتے ہیں۔ بوڑھے دادا اپنے آغوشِ تربیت میں لے لیتے ہیں، لیکن بچہ کا بچپن ابھی ختم نہیں ہونے پاتا کہ وہ بھی ہمیشہ کی نیند سوجاتے ہیں۔ گھر میں نہ نقد ہے نہ جائداد، نہ حکومت ہے نہ ریاست۔ خانہ ویرانی کا یہ عالم ہے کہ نہ ماں ہے نہ باپ۔ نہ دادا ہیں نہ دادی۔ نہ بھائی ہیں نہ بہن۔ تن تنہا، بے ساز و سامان، بے یار و مددگار، ایک نوعمر اللہ کا بندہ ہے، جسے سہارا ہے تو اسی نظروں سے اوجھل مولا کا، اور آسرا ہے تو اسی نگاہوں سے غائب مالک کا۔

عربوں کی حالت

ملک کی حالت یہ کہ شرک کی گھٹائیں ہر طرف چھائی ہوئی، ساری قوم مخلوق پرستی میں

ڈوبی ہوئی، بدکاری فیشن میں داخل، انسانی ہمدردی کے مفہوم سے دماغ ناآشنا۔ ہر قسم کے فسق و فجور کی گرم بازاری، بات بات پر لڑنا اور پشتہا پشت تک لڑتے رہنا، یتیموں کی حق تلفی غریبوں کے ساتھ بے دردی۔ اخلاقی وبائیں اور روحانی بیماریاں گھر گھر پر مسلط۔ یہ حد سے گزری ہوئی حالت تو خاص اسی قوم کی اور اس کے ملک کی۔

دُنیا کا رنگ

باقی جتنی ہمسایہ قومیں ہیں، ان میں سے کسی ایک کی بھی زندگی، پاکی و پاکیزگی کے معیار پر نہیں۔ مصر و ایران، چین وھندوستان، مشہور تھا کہ یہ تمام ملک ایک زمانہ میں علم و فن تہذیب و تمدن کے گہوارے تھے، لیکن اس وقت سب کے سب اخلاقی گندگیوں اور روحانی ناپاکیوں کے زینے بنے ہوئے تھے۔ توحید و خدا پرستی جو سارے اخلاقی نشو و نما کی جڑ ہے، بڑے سے وہی کٹی ہوئی۔ خالق کی یاد دلوں سے غائب، اور طرح طرح کے وسیلوں اور واسطوں کی پرستش ہر دل میں رچی ہوئی، متفرق طور پر کہیں کہیں اصلاح کرنے والے بھی پیدا ہوتے ہیں، لیکن سیلاب کی رو میں کس کے قدم جم سکتے ہیں؟

ظہورِ قُدسی

فضائے ملک بلکہ فضائے عالم کی اس تیرگی میں یہ نوعمر یتیم کھڑا ہوتا ہے، اور اپنی پاک اور پاکیزہ کتابِ زندگی کے ہر ورق کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اور اپنی زندگی کا ایک کامل و مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرکے، حوصلہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے جیسا بنایا جائے۔ ایک طرف ساز و سامان سے محرومی ہے۔ ہر پہلو سے بے کسی اور بے بسی ہے، ہر اعتبار سے بے اختیاری ہے، اور دوسری طرف ملک و قوم کی اصلاح کی امنگیں ہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ ساری کائنات انسانی کے سدھارنے کے حوصلے ہیں۔ لیکن "اصلاحِ قوم" آجکل کے مفہوم میں نہیں۔ اس لئے نہ کسی انجمن کی بنیاد پڑتی ہے، نہ کوئی پارٹی بنائی جاتی ہے، نہ کسی کمیٹی کے لئے کوئی فنڈ کھولا جاتا ہے، بلکہ سارا وقت

اور ساری قوت اپنے آپ کو تیار کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ یہ نوعمر، حسین و خوش شرد ہے۔ نوجوانی کا خون اس کی رگوں میں بھی گردش کرتا ہے۔ ملک میں گھر گھر فحش و بے حیائی کے چرچے ہیں، لیکن اس کی نیچی نظروں پر خود حیاداری قربان ہو ہو جاتی ہے۔ مئے نایاب کے ساغر ہر طرف چھلک رہے ہیں، پیمانہ چاروں طرف گردش میں ہے، لیکن اس کے دامنِ تقوےٰ پر فرشتے تک نماز پڑھنے کے آرزومند ہیں۔ لوگ لڑ رہے ہیں، یہ صلح کرا رہا ہے۔ قوم چھیننے میں معروف ہے، یہ بانٹتے ہیں۔ دنیا تحصیل و فراہمی میں لگی ہوئی ہے اور یہ عطا و بخشش میں۔ عالم مخلوق پرستی کی لعنت میں مبتلا ہے، ایک اس کے دل میں خالق کی لو لگی ہوئی ہے۔

اصلاح کی جڑ، خدا پرستی و توحید

ساری اصلاحوں کی بنیاد تو ایک ہی اصلاح ہے یعنی بندہ کا مالک سے تعلق پیدا ہو جانا، اس ٹوٹے ہوئے رشتے کا جڑ جانا، اور شرک کی بھول بھلیاں سے نکل کر توحید کی شاہراہ پر آجانا۔ یہاں بھی دھن تھی تو اسی کی، اور فکر تھی تو اسی کی۔ رات کی نیند، دن کی مشغولی، ہر شے اسی کی نذر تھی۔

تڑپ اور وحی

آفتاب اور ماہتاب کی گردشیں اپنی اپنی میعادیں پوری کر رہی ہیں۔ بچے جوان ہوتے ہیں اور جوان ادھیڑ ہو رہے ہیں۔ موتی صدف کے اندر اور لعل و جواہر کانوں میں نشو و نما پا رہے ہیں۔ عالم قدس کا یہ دُرِ یتیم چالیس برس کے سن میں اپنی پختگی کو پہنچتا ہے۔ عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ ہدایت پانے کا جوش و ولولہ بھی ترقی پر ہے اور "یافت" کی تڑپ روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے، یہاں تک کہ نوبت یہ پہنچتی ہے کہ آبادی کے شور و غل سے الگ، انسانوں کے مجمع سے دور، ایک غار کے سکون و خلوت میں ہفتوں کے ہفتے اسی سوچ بچار، اسی گرہ کی کشائش کے نذر ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت ایک غیبی سہارا دستگیری کرتا ہے

اور منصب ارشاد و خلق و ہدایت عالم پر سرفرازی کا پروانہ ملتا ہے۔

کٹھن کام

کٹھن کام اب شروع ہوتا ہے۔ ایک طرف ملک حجاز کی قوت و جمعیت ہے اور دوسری طرف تن تنہا ایک فرد اصلاح و ہدایت کا کام ہاتھ میں لینے والا، صدیوں کی پڑی ہوئی خصلتوں کا چھڑانا، سینکڑوں برس کے زنگ دلوں سے دُور کرنا، ایک دو شخص نہیں، ایک خاندان نہیں، ایک قبیلہ نہیں، سارے ملک کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا۔ پھر زندگی کی کوئی ایک صنف نہیں، ہر صنف اور ہر شعبۂ زندگی کو نئے سر سے بدلنا اور یہ پیام پہنچانا کہ اپنی زندگی بالکل نئی کر لو، مال و دولت کی محبت چھوڑ دو، بخل اور کنجوسی کو چھوڑ دو، حرصِ حکومت و ہوسِ جاہ کو چھوڑ دو، اپنی جھوٹی شاعری اور موسیقی کو چھوڑ دو، رشوت، سود خوری کو چھوڑ دو، خیانت اور بد معاملگی کو چھوڑ دو، جوئے اور شراب کو چھوڑ دو، بیحیائی اور بدکاری کو چھوڑ دو، عورتوں اور غلاموں پر ظلم کرنا چھوڑ دو، لڑکیوں کے زندہ دفن کر دینے کو چھوڑ دو، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے معبودانِ باطل کو چھوڑ دو۔

اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ گویا ایک نازک و لطیف شیشہ کی ٹکر، ایک ٹھوس اور سخت چٹان سے لگی، ساری شیطانی اور طاغوتی قوتوں نے اکٹھے ہو کر اس زمزمہ سرائے توحید پر یلغار کر دیا۔ کنبہ والے بگڑے کہ سارے کنبہ سے یہ انوکھی بات کیسی زبان سے نکالی..... برادری والے روٹھے کہ باپ دادا کی ریت رسم کو کس منہ سے بُرا ٹھیرایا۔ بستی والے الجھے کہ امن و چین کی زندگی میں یہ خواہ مخواہ ایک تفرقہ و فساد کھڑا کر دیا۔ غرض خاندان مخالف، برادری مخالف، شہر کی ساری آبادی مخالف، وطن کے در و دیوار مخالف اور چشمِ ظاہر میں تو یہ نظر آنے لگا کہ وہ جو اس بزمِ ہستی کا صدر بنا کر بھیجا گیا، زمین کے ذرے اس کے مخالف، آسمان کے تارے اس کے مخالف،

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

اور ہم نے تو تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے

بلندیِ ذکر کی بشارت

ایک طرف ادائے فرض کا احساس۔ دوسری طرف مخالفتوں کا یہ ہجوم بے پایاں!

عین اس وقت[1] جب کہ عالم بشریت میں سامانِ تسکین و تشفی ممکن نہ تھا۔ یہ صدا ئے غیب کانوں میں آتی ہے کہ اے ہمارے پیارے اور فرمانبردار بندے! گھبرانے اور ہمت چھوڑنے کی کوئی بات نہیں۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ..... ہم نے تو تیرے اوپر وہ لطف و کرم کیا ہے جو کبھی کسی بندہ پر نہیں کیا تھا۔ موسیٰ کلیم اللہ کو ہم سے شرفِ ہم کلامی کے بعد بھی شرح صدر کی آرزو باقی رہی[2]۔ انہوں نے اس نعمت کے لئے دعا کی۔ تجھے ہم نے یہ نعمت عظمیٰ بلا طلب عنایت کی۔ تیرے سینے کو اپنی معرفت کے لئے کھول دیا۔ اسے اپنی نورانیت سے لبریز کر دیا۔ اور اپنی آیات و دلائل کو تیرے اوپر واضح و روشن کر دیا[3]۔ اصلاح خلق کے لئے ہم تیری تڑپ دیکھ رہے تھے۔ یہ فکر تجھے ہلاک کئے ڈالتی تھی کہ لوگوں کو کیونکر راہ راست پر لایا جائے[4]۔ مراسم شرک سے تجھے شروع سے نفرت رہی ہے[5]، وہ ہماری نظر سے چھپی ہوئی نہیں۔ اصلاح خلق کے لئے تیری دھن، خود راہ راست دکھانے کی فکر کا بار[6]۔ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ..... تیری پشت کو توڑے ڈالتا تھا۔ ہم نے اپنے فضل و کرم

---

[1] سورۂ نشرح کا زمانۂ نزول بعثت کے ابتدائی ایام میں ہے جبکہ مخالفت کا شباب تھا۔

[2] رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (طٰہٰ ع ۱)

[3] شرح الصدر ای بسطہ بنور الٰہی وسکینۃ من جہۃ اللہ وروح منہ (راغب)

[4] لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (شعراء ع ۱)

[5] وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ

سے اس بار سے تجھے نجات دے دی، اور یہی نہیں کہ وحی کی روشنی دے کر خود تجھے راہ راست پوری کی پوری دکھا دی، بلکہ اس نعمت سے بھی سرفراز کر دیا کہ دوسروں کو بھی راہِ ہدایت دکھا تا رہ۔ مخالفین کے منصوبوں اور شرارتوں سے تنگ دل نہ ہونا، تو ہماری حفاظت میں ہے، یہ تیرا کچھ بھی نہیں کر سکتے، آج یہ نالائق اپنے نزدیک تجھے مٹا دینے کی فکر میں ہیں لیکن ہم نے تو تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے۔ پھر جس ذکر کو ہم بلند قرار دیں، کون بشر اسکی بلندی کا پورا اندازہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ...... کر سکتا ہے۔ یہ مخالفتیں اور یہ سازشیں تجھے تو کیا مٹا سکیں گی، مخالفین اور سازش کرنے والے خود ہی مٹ جائیں گے اور تیرا نام ان سب کو پست و سرنگوں کر کے خود ممتاز و سر بلند رہے گا۔

کایا پلٹ

یہ آواز اس وقت دنیا کے سامنے بلند ہوئی تھی جب اسلام کے خلاف دولت، امارت، اور حکومت کی ساری قوتوں کا ایکا تھا۔ جب اسلام محدود تھا۔ تنگ دستوں اور بے کسوں، ضعیفوں اور شکستہ حالوں کی ایک مختصر سی جماعت میں جب اللہ کا نام زبان پر لانے کا انعام ملتا تھا، گالیوں اور ذلتوں، تازیانوں اور عقوبتوں سے۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ چند ہی روز میں کیسی کایا پلٹ تھی! قریش کے زور آور سردار خاک میں مل گئے۔ انکے حلیف اور حمایتی مٹ کر رہ گئے۔ دولت مند ہو کا تختہ الٹ گیا۔ اور جن کی عقل و فہم پر قوت و اثر

لہ وزر کے معنی بعض ارباب شرح و تفسیر نے "اثم" گناہ کے لئے ہیں، حالانکہ لغت عرب میں اس کے معنی مطلق "ثقل" (بار) کے آتے ہیں۔ یہاں متن میں جو پہلو اختیار کیا گیا ہے، بیضاوی نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ ھو ما ثقل علیہ من ...... او ما کان یری من ضلال قومہ مع العجز عن ارشادھم، بغوی نے اس سے بھی زیادہ صراحت سے کہا ہے کہ وزر سے مراد قوم کی بدکاریاں ہیں جن کی فکر ہر وقت آپکو دامنگیر رہتی تھی۔ وقیل ذنوب امتہ فاضافہا الیہ لاشتغال قلبہ بہم۔
(معالم و خازن)

پر، دولت و سرمایہ پر، زمانہ کو ناز تھا، ان کے نام تک صفحۂ روزگار سے مٹ گئے۔ ساڑھے تیرہ سو برس کی مدت میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ عقل و دانش کی کتنی منزلیں، حد و حساب سے باہر، اعداد و حساب سے خارج، طے ہو چکیں، الحاد و مادیت کی قلمرو کتنی وسیع ہو چکی۔ پر آج خالق کے نام کے ساتھ جس مخلوق کا نام زبانوں پر آتا ہے، اللہ کے ذکر کے ساتھ جس بندہ کا ذکر کانوں تک پہنچتا ہے، وہ کسی قیصر و کسریٰ کا نہیں، کسی زار و فغفور کا نہیں، دنیا کے کسی شاعر و ادیب کا نہیں، کسی حکیم و فلسفی کا نہیں، کسی جنرل اور سردار کا نہیں، کسی گیانی اور کسی راہب کا نہیں، کسی رشی کا نہیں، یہاں تک کہ کسی دوسرے پیمبر کا بھی نہیں، بلکہ عبداللہ کے لختِ جگر، آمنہ کے نورِ نظر، خاک بطحا کے اسی بے کس و بے بس یتیم کا، جسے قریش کے زور آور، جہل و نخوت کے نشہ میں اپنا ہی جیسا محض ایک مشت خاک سمجھ رہے تھے۔ کشمیر کے سبزہ زار میں، دکن کی پہاڑیوں میں، افغانستان کی بلندیوں میں، ہمالیہ کی چوٹیوں میں، گنگا کی وادیوں میں، چین میں، جاپان میں، جاوا میں، برما میں، روس میں، بخارا میں، مصر میں، ایران میں، عراق میں، شام میں، فلسطین میں، ٹرکی میں، نجد میں، یمن میں، مراکش میں، طرابلس میں، ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں، اور ان سب مہذب، نیم مہذب ملکوں کو چھوڑ کر خاص نافِ تمدن و مرکزِ تہذیب لندن، پیرس اور برلن کی آبادیوں میں، ہر سال نہیں، ہر ماہ نہیں، ہر ہفتہ نہیں، ہر روز بھی پانچ پانچ مرتبہ، بلند میناروں سے جس نام کی پکار خالق کے نام کے ساتھ فضاؤں میں گونجتی ہے، وہ اسی ایک سچے اور اچھے کا نام ہے، جسے بصیرت سے محروم دنیا نے ایک زمانہ میں محض ایک بیکس اور یتیم کی حیثیت سے جانا تھا۔

رفعتِ ذکر کی تفسیر

یہ معنی ہیں یتیم کے راج کے۔ یہ تفسیر ہے وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ کی۔ کسی ایک صوبہ پر نہیں، کسی ایک جزیرہ پر نہیں، کسی ایک ملک پر نہیں، دنیا پر۔ دنیا کے دلوں پر، آج حکومت ہے تو اسی یتیم کی، راج ہے تو اسی امی کا۔ روشن خیال مصری دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اسی کے نام سے

برکت حاصل کرتا ہوا، خوش عقیدہ افغانی ڈھونڈتا ہے پناہ تو اسی اسمِ پاک کی، جانباز ترکِ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اسی کے نام کا کلمہ پڑھتا ہوا، اور مراکش کا مجاہد سینہ پر گولی کھا کر گرتا ہے تو اسی کے نام کی بلندی کی گواہی دیتا ہوا۔ شاعر اگر ان مشاہدات کے بعد بے خود ہو کر پکار اٹھے کہ ہمسر نامِ الٰہی نامِ تست...... تو کون اس کی زبان پکڑ سکتا ہے..... اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمْ عَلَیْہِ۔

انعاماتِ خداوندی کا نزول۔ ہر سختی کیساتھ آسانی

اس پُر قوت بشارت، اس سچی پیش گوئی کے ساتھ جو صرف ہیبے ہی کی زبان سے ادا ہو سکتی تھی، قانونِ الٰہی کی یہ دفعہ بھی سنا دی گئی کہ ہر سختی کے ساتھ آسانی ہے، شرح صدر ہو چکا، سینۂ مبارک کو فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا..... انوارِ معرفت و سکینت سے بھرا جا چکا، وحی کی روشنی مرحمت کی جا چکی، پھر بھی عسر و یسر، تنگی و کشائش کا قانون دائمی اور ناقابلِ تبدیل ہے۔ مفسرین میں سے بعض کا قول ہے کہ پہلی کشائش سے اسی دنیا کی نعمتیں اور دوسری کشائش سے آخرت کی راحتیں مراد ہیں۔ اور پھر ایک جماعت اس جانب بھی گئی ہے کہ ایک کشائش سے اشارہ عہدِ رسالتؐ کی فتحمندیوں کی طرف ہے اور دوسرے سے عہدِ خلفاء راشدین کے دورِ اقبال کی جانب۔ یہ سب مفہوم اپنی اپنی جگہ پر درست ہو سکتے ہیں، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس تکرار سے درسِ ہدایت پر زور دینا رسولؐ اور امت دونوں کے معنی میں الگ الگ مقصود ہو، یعنی جس طرح اس عبد کامل کو عسر کے بعد یسر حاصل ہوا ٹھیک اسی طرح اس یتیم کے پیروؤں کے لئے بھی راستہ کھلا ہوا ہے، تنگی کے بعد کشائش ان کے نصیب میں بھی آنی یقینی ہے۔

آخر میں یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اب جبکہ ہم نے تم کو اس بار سے ہلکا کر دیا ہے۔ جب اصلاحِ امت کا کام بجائے اس کے کہ تم اپنی عقل و فکر کے ذمہ رکھو، ہم نے اپنی وحی کے ماتحت کر دیا ہے جب اس فکر و تدبیر کے کام سے ہم نے تمہیں فارغ و سبکدوش کر دیا ہے، تو بس اب تم بھی پوری طرح ہمارے احکام کو پہنچانے...... فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ

فَانْصَبْ ..... فرائض رسالت کے انجام دینے، خلقت کو راہِ ہدایت دکھانے میں لگ جاؤ،
اور اس راستہ میں ہر تکلیف اور محنت کو برداشت کرو[1] اور جس پروردگار نے تمہیں اس مرتبہ
سے سرفراز کیا ہے، جس نے تمہارے لئے ہجوم مشکلات میں یہ کشائش پیدا کر دی ہے، جس
نے تمہارے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا کر تمہارے ذکر کو یوں ہمیشہ کے لئے بلند کر دیا
ہے، تمامتر اس کی طرف لو لگائے رہو۔ سب سے بے پروا و بے نیاز، ایک اسی کے نام
کا چرچا کرنے میں، ایک اسی کی پاکی پکارنے میں، ایک اسی کی بڑائی کے پھیلانے میں جان و دل
سے لگے رہو۔

یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

مکہ کا وہ یتیم آج خود ہی سب سے سر بلند اور ساری دنیا کا سرتاج نہیں، بلکہ کارسازِ مطلق
کی اس شانِ کریمی کی بلائیں لیجئے کہ اس کی یتیم کے طفیل میں، آج دنیا کے سارے یتیم، غریب سے
غریب، بیکس سے بیکس یتیم، اپنی اپنی ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں، یتیم خانوں کی کوٹھڑیوں میں، بازار
کی گلیوں میں، محل کے رہنے والے امیرزادوں اور شہزادوں سے کہیں زیادہ سر بلند اور کہیں
زیادہ معزز ہیں۔ وہ خوش نصیب پاک بندے جن کے لئے اس ناسوتی زندگی کی قید سے
رہا ہونے کے بعد چین ہی چین ہے، ان کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مسکینوں
اور یتیموں کو محض اپنے پروردگار وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا
وَيَتِيمًا ..... کی رضاجوئی کے لئے خلوص کے ساتھ، نہ کہ کسی نمائش و ریا کی غرض سے کھانا
کھلاتے رہتے ہیں، اور جن بدنصیبوں کو یہاں اور وہاں ذلت کی سزا بھگتنی ہے ان کا خاص
جرم یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہ یتیموں کے كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ..... ساتھ، خواہ
کوئی خاص بدسلوکی نہ بھی کرتے ہوں، تو بھی کیا کم ہے کہ وہ ان کی پوری عزت اور خاطرداری نہیں
کرتے۔ شرفِ انسانیت کی سب سے بلند گھاٹی بغیر اس کے طے ہی نہیں ہو سکتی۔ انسانیت

---

[1] النصب، التعب (راغب) فانصب، فاتعب (بیضاوی)

کے مرتبۂ کمال تک رسائی ممکن ہی نہیں جب تک قیدیوں اور غلاموں کو آزاد کرانے اور بھوک کے وقت یتیموں کو کھانا کھلانے کا شعار نہ بنا لیا جائے ...... وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اتنا ہی نہیں، بلکہ اصلی دین یہی ہے کہ یتیم کی خاطر مدارات، عزت و توقیر کی جائے اور جو بدنصیب یہ نہیں کرتا، وہ خواہ بظاہر کیسا ہی نمازی ہو، لیکن أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ ...... اگر یتیم کے حق کو نہیں پہچانتا، تو اپنی دینداری کے دعوے میں جھوٹا ہے، اس کی ساری مذہبیت مصنوعی اور نامقبول ہے [1]

---

[1] یہاں جن آیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف وہی ہیں جن میں اکرام یتیم کا اخلاقی و روحانی پہلو نمایاں ہے، اور وہ بھی سب آیتیں نہیں، صرف نمونہ کے طور پر دو چار لے لی گئیں۔

باقی جن آیات میں یتیموں کے قانونی حقوق پر زور دیا گیا ہے، ان کا ذکر بالقصد یہاں ترک کر دیا گیا۔ مثلاً وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ (نساء۔ آیت ۲) وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ (نساء آیت ۳)
وَأَن تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ (نساء آیت ۱۲۷) وغیرہا۔

انہوں نے جو کچھ کہا وہ تو بہر حال کہتے ہی ہیں، دیکھئے یہ کہ منکر اور بیگانہ، اور قرآن مجید کو ایک مکی یتیم کی تصنیف قرار دینے والے کی زبان کیا شہادت دے رہی ہے:

"قرآن کو پڑھ کر سب سے زیادہ قابل داد چیز یہ ملتی ہے کہ محمدؐ کو بچوں کا کس درجہ خیال رہتا تھا، خصوصاً ان بچوں کا جو اپنے قدرتی والی وارث کے سایہ سے محروم ہو چکے ہوں، بار بار ان کی تعلیم بھی ملتی ہے کہ بچوں کے ساتھ عدل و شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔" (ص ۴۰۔۴۱)

"یتیموں کے حقوق کا محمدؐ کو خاص اہتمام تھا۔ ان کا بار بار یتیموں کا ذکر لانا اور یتیموں کے حقوق غصب کرنے والوں، اور ان کے ساتھ ناانصافی برتنے والوں کے خلاف سخت وعیدیں، یہ سب

(باقی اگلے صفحے پر)

آج ہے دنیا کا کوئی مذہب، جس نے یتیموں کو یہ مرتبہ دیا ہو؟ جس نے یتیمی کو بجائے ایک باعثِ ننگ داغ سمجھنے کے، اس قابلِ رشک درجۂ شرف واحترام پر پہنچا دیا ہو؟ آج ہے دنیا کا کوئی ایسا مذہب بجز اس ایک اکیلے، سچے دین کے، جو ایک یتیم کا لایا ہوا ہے؟

(گذشتہ سے پیوستہ)

سیرت محمدی کی اس پاکیزہ پہلو پر دلیل ہیں، جس پر مسلمان مصنفین اکثر اور بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔"

(صا۴)

"..... اور بھی متعدد آیتیں نقل کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ محمد کو اس باب میں کس قدر اہتمام تھا۔ حقیقتاً اس سے بڑھ کر اور کسی معاملہ پر قرآن میں زور نہیں ملتا، چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں میں مال یتیم کے غصب کرنے کا گناہ، کبائر میں شمار کیا گیا ہے۔ ان کبائر میں جن کی تعداد عموماً صرف سات انی گئی ہے۔" (صـ۴۲-۴۳)

ملاحظہ ہو ڈاکٹر رابرٹ رابرٹس پی ایچ ڈی کی کتاب "قرآن کے قوانین معاشرت"۔

یتیم کی جیت

کریمُ السجایا جمیل الشیم — نبی البرایا، شفیع الامم

امام رسل پیشوای سبیل — امینِ خُدا، مہبطِ جبرئیل

یتیمی کہ ناکردہ قرآں درست — کتب خانۂ چند مِلّت بشست

—— سعدی

یتیم کی جیت

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ

"اے رسول! ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمایا"

بے بسی اور حکمت الٰہی

جو زور والے تھے ان کا زور توڑنے کے لئے، جو گھمنڈ والے تھے انھیں نیچا دکھانے کیلئے، جو حکمت اور حکومت والے تھے ان میں عبدیت کی شکستگی پیدا کرنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر، اپنی بے مثال قدرت و حکمت کا بے مثال نمونہ دکھانے کے لئے انتخاب اس کا کیا جاتا ہے، جو نہ زر رکھتا ہے نہ زور، نہ اس کے جلو میں سوار اور پیادے ہیں اور نہ اس کی بغل میں علوم و فنون کی پوتھیاں۔ ایک بے یار و مددگار یتیم بچہ، جس کی ولادت سے قبل ہی اس کے باپ کو اٹھا لیا جاتا ہے عرب کی سرزمین پر نمودار ہوتا ہے اور اسے حکم ملتا ہے کہ اپنے خاندان اور اپنے قبیلہ ہی کی نہیں، سارے ملک کی بھی نہیں، سارے عالم کی اصلاح پر کمربستہ ہو جائے۔ عقل حیران، دماغ متحیر!

سرمایہ داروں اور سامراجیوں کے قہقہے

جنہیں اپنی تہذیب و شائستگی پر ناز تھا، انھوں نے قہقہے لگائے، جنہیں خطابت و سحر بیانی کا دعویٰ تھا، انھوں نے تالیاں بجائیں، جنہیں آجکل کی برہنہ تصویروں اور نیم برہنہ صورتوں کی طرح اپنی برہنہ شاعری پر فخر تھا، انھوں نے آوازے کسے، مال اور جتھے والوں کے تیور پر بل پڑے، اور جو زور و قوت والے تھے، وہ تن تن کر اور اکڑ اکڑ کر میدان میں نکل آئے۔

نُور اور ظُلمت کی آویزش

مقابلہ زور اور ضعف کے درمیان ـــ جسے دنیا زور اور قوت سے تعبیر کرتی ہے اور جسے دنیا ضعف و ناتوانی کہہ کر پکارتی ہے۔ ایک طرف سامان کی فراوانی، دوسری طرف بے سروسامانی؛ ادھر معابد اور سازشیں، ادھر تنہائی کی عبادتیں؛ یہاں ریاست و سرداری، وہاں فاقہ و نادرای؛ اِس طرف جاہ و تجمل، اُس طرف فقر و توکل ـــ جو اکیلا اور دُنیا کی نظروں میں بے یار و یاور تھا، اس پر خوب جی بھر کے ٹھٹھے لگائے گئے۔ اور جو شان کے اونچے اور جتھے والے تھے، انھوں نے پکار پکار کر کہا کہ ذرا سُننا اور دیکھنا، اس تخیل کو تو دیکھنا کہ جسے جھونپڑا ابھی نصیب نہیں، وہ محلوں کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اور جو اپنی بے بسی اور بے کسی کے دور کرنے پر قادر نہیں، وہ دنیا کو راہ ہدایت دکھلانے کا دعویٰ اور خلق کو جادۂ اصلاح پر لانے کا حوصلہ کر رہا ہے؟ ـــ یہ سب کرشمے وہ دکھا رہا تھا، جس نے نمرود کا بھیجا ایک مچھر کے ذریعے سے پاش پاش کر دیا تھا؛ ... جس نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی خوراک بنا دیا تھا، اور آج بھی لارڈ کچنر اور لارڈ ٹامسن[1] کو دم کے دم میں ڈبوتا اور جلاتا اور زارِ روس اور زارینہ کو، آن کی آن میں مارتا اور ہلاک کرتا رہتا ہے۔

کفّارِ قریش کی جھُوٹی مسرت

قدرت اور حکمت کا تازہ ظہور یوں ہوتا ہے کہ خدائے واحد کے اس اکیلے پرستار کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ، اس کی آنکھوں کے سامنے جان دیتا ہے۔ اور جو دشمن کی بھی تکلیف کو دیکھ کر تڑپ جاتا تھا، اس کا ننھا اور معصوم لختِ جگر اسی کے آغوشِ شفقت میں دم توڑ کر رہتا ہے۔ اللہ اللہ! کیا شان بے نیازی اور کیا جلوہ حکمت آرائی ہے کہ باغیوں اور سرکشوں کی 'اولاد' اور اولاد در اولاد پھل پھول رہی ہے۔ اور جو اپنے رب کا نام جپنے والا ہے اُسے اس نعمت سے بھی محروم کیا جا رہا ہے اور

---

[1] برطانیہ کے شعبۂ فضائی کے وزیر، ۱۹۳۱ء میں ہوائی جہاز میں آگ لگ جانے سے ہلاک ہوگئے۔

کے پاس نہ دولت تھی نہ حکومت، نہ اس کی کوئی بڑی پارٹی تھی، نہ اس کے معتقدین کا کوئی وسیع حلقہ؛ ہر طرف سے مخالفت کا ہجوم، ہر سعی و اصلاح میں ناکامی، ہر دعوتِ حق میں بے اثری، غرض ہر دنیوی نعمت سے محرومی چشمِ ظاہر کو پہلے ہی سے نظر آ رہی تھی، لے دے کے یہ جو آخری نعمت تھی، اب یہ بھی چھن کر رہ گئی۔ دنیا ایسے مواقع پر کیا رائے قائم کرتی؟ اس نے وہی رائے قائم کی جو اندھوں اور بے بصروں نے ہمیشہ قائم کی ہے۔ وہ ہنسی، وہ مسکرائی، وہ خوشی سے اچھلی اور کودی۔ عاص بن وائل[2]، منکروں کا ایک سردار اور ناہنجاروں کا ایک پیشوا تھا۔ اس نے چمک چمک کر اور مٹک مٹک کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چلو چھٹی ہو گئی۔ محمدؐ کی نسل ختم ہو گئی۔ اور آگے نہ اس کے کام کو چلانے والا کوئی باقی رہا نہ اس کے نام کا لینے والا، دیکھا ہمارے دیوتاؤں سے بے ادبی کرنے کا یہ انجام۔۔۔۔ جنھوں نے محمدؐ کو محض گوشت و پوست کا مجموعہ سمجھ رکھا تھا، وہ اس طعنہ میں شاید معذور بھی تھے، کوئی کس طرح دکھا دیتا کہ کس عنصری کا لفافہ اپنے اندر کس روح مطہر کو ڈھانپے اور چھپائے ہوئے ہے۔

بہرحال غیرتِ حق نے اس طعن کو سنا، اور اب اس میں حرکت ہوئی۔ آواز آتی ہے اور وہاں سے آتی ہے جہاں نہ الفاظ کا گزر ہے نہ حروف کا پتہ، کہ یہ بے خبر اور بے بصر، یہ غافل اور جاہل، تیرے اوپر طعنہ زن ہیں۔ ان بدبختوں کو کیا خبر کہ ہم نے تجھے خیرِ کثیر دے رکھی ہے، بھلائیوں کے خزانے در خزانے تجھے عطا۔۔۔۔ انا اعطینٰک الکوثر[1]۔۔۔۔ کر رکھے ہیں۔ ساری اچھائیوں، ساری خوبیوں، ساری محبوبیوں کا مالک تجھے بنا رکھا ہے۔ تیرے لئے کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں بھی عقبیٰ میں بھی؟ جسے دینے والے ہم ہوں اس کی دولت مندی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ جسے بخشنے والے ہم ہوں اس کی نعمت اندوزیاں کس کے شمار میں آ سکتی ہیں؟ جس پر مہربان ہم ہوں اس کے جاہ و جلال، اس کے عز و کمال، اس کے حسن و جمال، اس کے مال و منال اور

---

[1] سورۂ کوثر کی سورت ہے۔

[2] قال ابن عباس و مجاهد و سعید بن جبیر و قتادة نزلت فی العاص بن وائل (ابن کثیر)

اس کے اوج و اقبال کا احاطہ کرنا کس کے بس کی بات ہے؟

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ

خیرِ کثیر

دینے والا تو یہ ہوا، اور دیا کیا گیا؟ بہت اور بہت ہی بہت "کوثر"۔ اس کوثر کی تشریح کون کرے اور کن الفاظ سے کرے؟ ارباب شرح و تفسیر میں سے سب نے اپنے اپنے مذاق کی پیروی کی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ:

"کوثر سے مراد جنت کی نہرِ کوثر اور محشر کا حوضِ کوثر ہے۔"

اور کسی نے لکھا ہے کہ:

"دوسرے انبیاؑ پر جو فضیلت و سربلندی دی گئی ہے وہ اس سے مراد ہے۔"

بے شک یہ سب کچھ مراد ہو گا۔ لیکن لفظ کے مفہوم کی وسعت کو کیوں محدود کیجئے، اور کیوں نہ اسے انہی فراخیوں اور پہنائیوں کا حامل رہنے دیجئے جو بخشنے والے اور عطا کرنے والے کی شانِ یکتائی کے شایاں ہیں۔ اللہ اکبر! جن نعمتوں اور جن بخششوں کو بے تکان اور بے اندازہ بخشنے والا 'خود' "بہت" اور "بہت ہی بہت" فرمائے، ان کے رقبے کی پیمائش کے لئے، انسان بے چارہ کوئی پیمانہ کہاں سے لائے؟ اہلِ لغت نے بہت ہاتھ پیر مارے۔ کوثر کی شرح مختلف عنوانوں اور متعدد پیرایوں سے کی بالآخر یہی کہتے بنا کہ:

وَمَا لَا یُحْصٰی مِنَ الْخَیْرِ[1]

وہ ان سب بھلائیوں پر شامل ہے جو شمار میں بھی نہیں آ سکتیں۔ اب مرادِ کلام واضح اور مفہومِ متکلم ظاہر ہے۔

نسل یا نام لیوا کے خاتمہ کا طعنہ

یہ خبیث طعنہ زن ہیں کہ تیری نسل ختم ہو رہی ہے اور تیرا سلسلہ منقطع ہو رہا ہے۔ تیری نسل

---

[1] صاحب لسان العرب نے بہت سے معانی دیکر آخر میں یہ فقرہ لکھا ہے اور مفرط الکثرۃ تو بہتوں نے لکھا ہے۔

بھلا کبھی ختم ہونے والی اور تیرا سلسلہ کبھی قطع ہونے والا ہے ؟ یہ بہ باطن دیکھنے کو زندہ نہ رہیں گے، لیکن ان کے جانشین دیکھیں گے، زمین و آسمان دیکھیں گے، جن و بشر دیکھیں گے، آفتاب و ماہتاب دیکھیں گے کہ تیری نسل قائم اور تیرا سلسلہ دائم ہے۔ بادشاہتیں بنیں گی اور بگڑیں گی، حکومتیں قائم ہوں گی اور مٹیں گی، شہر بسیں گے اور اجڑیں گے، قومیں ابھریں گی اور فنا ہوں گی لیکن تیرا نام زندہ اور تیرا کام پائندہ، قیامت تک قائم اور قیامت کے بعد بھی قائم۔ دنیا میں تیرے نام کی وہ عزت ہوگی جو نہ آج تک کسی بندہ کی ہوئی نہ آئندہ ہوگی۔ اونچے اونچے میناروں سے تیرا نام ہمارے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ دشت و جبل، صحرا و دریا، بحر و بر، شہروں اور دیہاتوں، آبادیوں اور ویرانوں، سمندروں اور پہاڑوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں سب کہیں تیرے نام کی منادی ہو گی۔ حجاز و عراق، یمن و شام، حبش و مصر، ایران و توران، بخارا و ہندوستان، چین و جاپان، روس و افغانستان، جرمنی و انگلستان، فرانس و امریکہ، دنیا کا گوشہ گوشہ اور ہماری وسیع زمین کا چپہ چپہ تیرے نام کی پکار سے گونجے گا۔ ذرہ ذرہ تیرے کام کی عظمت کی گواہی دے گا، اور تیرا نام ان ان کانوں تک پہنچے گا جو سوا تیرے ہر دوسرے ہادی کے نام سے ناآشنا ہوں گے۔ آج تو ان کور بصروں کی نگاہ میں حقیر ہے، کل تو ہی بلند کیا جائے گا، کل تیری ہی عزت ہو گی اور اس وقت ہوگی جب سب کی عزتیں پامال اور سب کی شہرتیں خاک میں مل چکی ہونگی۔ جو اپنی شامت سے تجھے مانیں گے نہیں، وہ بھی کم از کم جان ضرور لیں گے۔

معنوی اولاد

اور تیری صلبی اولاد کے بدلے ہم تیری معنوی اولاد کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر، انسان کے شمار و اعداد میں نہ سما سکنے والی تعداد میں قیامت تک ایسی پیدا کر دیں گے جو تجھے اپنے والدین سے کہیں بڑھ کر عزیز و محبوب و مکرم و محترم رکھے گی، جو اپنی نجات تیری رضا جوئی پر موقوف سمجھے گی، جس کی ورد زبان اٹھتے اور بیٹھتے تیرا ہی نام اور تیرا ہی کلمہ رہے گا۔ تیرے نام پہ بے گنتی اور بے شمار درود پڑھا جائے گا اور تیرے نام کی تسبیحیں صبح اور شام، دوپہر اور سہ پہر، آدھی رات کو اور پچھلے پہر، دن اور رات کے ہر لمحہ، ہر

پڑھی جاتی رہیں گی۔ تیرے نام کو وہ ادب اور وہ احترام ہوگا[1] جو کسی لڑکے نے اپنے باپ کا نہ آج تک کیا نہ آئندہ کرے گا۔ ہم نے بہتوں کو عزتیں بخشی ہیں، بہتوں کے مرتبے بلند کئے ہیں، بہتوں کو سرداریاں عطا کی ہیں، لیکن جو مرتبہ تجھے عطا ہو رہا ہے وہ بس تیرے ہی ساتھ مخصوص ہے۔

سیرتِ پاک کی عظمت

تیرے منہ سے نکلے ہوئے بول ایک ایک کرکے جمع کئے جائیں گے اور اس شغف واحترام، تحقیق واستناد کے ساتھ جمع کئے جائیں گے کہ ان کی کوئی نظیر دُنیا کی کوئی تاریخ، کوئی تذکرہ، کوئی ملفوظ، کوئی سوانحعمری نہ پیش کر سکے گی۔ تیری سیرت اور تیری تاریخ اس تفصیل و جامعیت کیساتھ دنیا کے حافظہ میں محفوظ رکھی جائے گی، جس کی مثال نہ کسی بادشاہِ کشورکشا کی سیرت میں ملے گی، نہ کسی نبی و ولی کے تذکرہ میں، تیرے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے ہنسنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، سب کا ایک ایک جزیہ محفوظ رکھا جائے گا۔ کروڑہا کروڑ، اور اربہا رب بندے اپنی نجات تیرے ہی نقشِ قدم پر چلنے سے وابستہ سمجھیں گے، بیسیوں اور سینکڑوں کتابیں تیرے ملفوظات اور تیرے معمولات پر تالیف کی جائیں گی، اور ہزارہا ہزار ان کی شرحیں تیار ہوں گی۔ اور خود تیری ذات تو بڑی چیز ہے جنہوں نے تجھے کبھی دیکھا، بلکہ جنہوں نے تیرے دیکھنے والوں کو دیکھا انھیں بھی زندہ رکھا جائے گا، انھیں بھی ممتاز و سربلند کیا جائے گا، ان کی سیرتیں بھی تاریخ کے نگارخانہ میں من وعن محفوظ رکھی جائیں گی۔ دنیا بڑے سے بڑے فلسفیوں کو، بڑے سے بڑے بادشاہوں کو بھول جائے گی لیکن نہ بھول سکے گی تو اس اَن پڑھ اور فاقہ مست بدوی کو جس کی خصوصیت بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ تیرے دیدارِ جمال سے مشرف ہوا ہے۔ دارا و سکندر، چنگیز و جولیس سیزر، نپولین و مسولینی، جالینوس و بقراط، فیثاغورث و سقراط، ارسطو و افلاطون، نیوٹن و

---

[1] ادب، احترام وہی ہے جو ممدوح کے شایانِ شان ہو۔ مثلاً یہ کہ رسول کو رسول کہہ کر پکارا جائے نہ یہ کہ اُسے ابن اللہ یا اوتار وغیرہ مانا جانے لگے۔ یہ تو صریح توہین ہوئی نہ کہ تعظیم۔

اسپنسر، اپنے علم وعمل کے بڑے بڑے کارنامے اپنی دانش پژوہیوں اور اپنی فتمندیوں کی بڑی بڑی یادگاریں اپنے نزدیک دنیا کے لئے چھوڑ کر جائیں گے۔ ان سب کی یاد رفتہ رفتہ بھلا دی جائے گی، یہ سارے نقش دیکھتے دیکھتے ماند پڑ جائیں گے اور لوحِ دہر پہ نقش قائم رکھا جائے گا تو تیرا اور تیرے غلاموں کا اور تیرے غلاموں کے غلاموں کا۔

رسول اللہ کی نام لیوا معنوی اولاد

تو اَن پڑھ ہے اور حروف وکتاب سے ناآشنا لیکن تیری عظمت کی گواہی دینے والے وہ ہوں گے، جنہیں ناز اپنے علم وفضل پہ اور دعوےٰ اپنے کمالِ فن کا ہوگا۔ کچھ لوگ تیرے اقوال اور ملفوظات کی جمع وتحقیق اور ان کی شرح وتفسیر میں اپنی اپنی عمر بسر کر دیں گے اور "بخاری و مسلمؒ" ابن حجر وابن جوزیؒ کی طرح محدثین کے گروہ میں محشور ہونا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھیں گے۔ ایک گروہ تیرے بتلائے ہوئے احکام کی جانچ پڑتال اور ان سے استنباطِ جزئیات کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دے گا اور ابو حنیفہؒ وشافعیؒ، مالکؒ وابو یوسف نخعیؒ ومزنیؒ کے مثل افتاء وتفقہ کو اپنے لئے باعثِ سعادت خیال کرے گا۔ ایک جماعت تیری باطنی تعلیمات کی دلدادہ ہو کر راہ سلوک ومجاہدہ میں پڑ جائے گی اور کتنے ہی جنیدؒ وشبلیؒ جیلانیؒ واجمیریؒ تیری ہی مشعل سے اپنے اپنے چراغ نسلاً بعد نسلٍ جلاتے رہیں گے۔ رومیؒ وسعدیؒ، حافظؒ وسنائیؒ، اکبر واقبال، اپنے شاعرانہ کمالات کو تیری غلامی پر نثار کر دیں گے۔ ابو حامد غزالیؒ اور ولی اللہ دہلویؒ اپنی سربلندی تیرے ہی بتلائے ہوئے حقائق واسرار کی تشریح وترجمانی میں سمجھیں گے۔ اور رازی وطوسی، فارابی و ابن سینا کو عقل ودلیل کے طوفان میں اگر پناہ کہیں ملے گی تو تیرے ہی دامن کے سایہ میں۔ حدیث، اصول، فقہ، سلوک، تصوف، کلام، کتنے ہی فن مخصوص تیرے ہی سلسلہ کی خدمت کے لئے عالم وجود میں آئیں گے اور علوم وفنون کے کتنے ہی علمبردار ہر ملک اور ہر قوم اور ہر زمانہ میں اپنے حصہ تحقیق وکاوش کو تیری خدمت کے لئے وقف رکھیں گے۔ برلن اور پیرس اور لندن، تیرے اور تیرے دین کے دشمنوں کے پایۂ تخت ہوں گے، لیکن تیرا نام ہمارے نام کے ساتھ ان شہروں میں بھی ہر روز اور ہر روز بھی پانچ پانچ وقت، بلند ہوتا رہے گا اور ہمارے عطاء کوثر کی شہادت

بہم پہنچاتا رہے گا۔

ظہورِ نتائج

یہ سب کچھ آب و گل والی دنیا میں ہوگا، اور ہوتا رہے گا اور اسے ناسوت والے اپنی مادی آنکھوں سے برابر دیکھتے رہیں گے۔ باقی جو کچھ اس عالم کے خاتمہ کے بعد، ہماری طرف مراجعت کے بعد ہوگا، اس کے فہم و ادراک کے لئے تو ان شامت زدوں نے اپنے پاس کوئی ادنے سا ذریعہ بھی باقی نہیں رکھا ہے۔ قرآن و نبوت کے اندر جو گہری اور حقیقی نعمتیں جھلک رہی ہیں اور شفاعت کبرےٰ و لوائے احمد، حوضِ محشر و نہرِ جنت کی نعمتوں کی قدر و قیمت کا اندازہ تو اسی وقت ہوگا جب یہ حقیقتیں پردۂ غیب سے نکل کر شہود میں آچکیں گی، اور افسوس ہے کہ اسوقت کی حسرتیں اور ندامتیں، پشیمانیاں اور پریشانیاں، کچھ ان کے کام نہ آئیں گی، لیکن اس مادی دنیا میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کے ظہور کے لئے تو زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں، جلد اور بہت جلد، پردہ آنکھوں سے ہٹنے کو ہے اور سب کو نظر آجانے کو ہے کہ ایک اولادِ صلبی کے عوض میں بیشمار اور بے حساب اولادِ معنوی تجھے دے کر، تیرے نام کو چمکا کر، تیرے کام کو پھیلا کر، عطاءِ کوثر کا مشاہدہ اسی دنیا میں کیونکر کرا دیا جاتا ہے۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

نماز اور قربانی

غرض دینے والا وہ جس کا نہ کوئی ثانی نہ کوئی شریک، نہ کوئی مثال نہ کوئی عدیل۔ اور دیا گیا وہ، جو نہ پہلے کسی پانے والے کو ملا تھا اور نہ آئندہ کسی خوش نصیب کے نصیب میں آئے گا۔ لیکن لینے والا بھی کون تھا؟ وہ نہیں جو اس لطف و کرم، جود و عطا، فضل و بخشش سے بھول میں آکر غفلت میں پڑ جائے اور اپنے تعلق باللہ کو ذرا بھی ماند پڑنے دے، اس کی طبع سلیم کا یہ فطری تقاضا ہے اور عین اسی کے مطابق اسے حکم بھی ملتا ہے کہ وہ برابر.....

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ..... اپنے پروردگار کی یاد میں لگا رہے. اس کے لئے نمازیں پڑھتا رہے اور قربانی کرتا رہے. الفاظ میں تصریح صرف دو عبادتوں کی آتی ہے. ایک نماز دوسری قربانی. لیکن یہی دو عبادتیں خلاصہ ہیں ساری عبادت کا. حقوق اللہ کی ادائی کی ساری صورتوں کی جامع، نماز ہے اور حقوق العباد کا لب لباب قربانی میں آگیا اور رسول کو یہ ہدایت کرکے، امت کے لئے بھی یہ اشارہ کر دیا گیا کہ جب فضل و کرم کی بارش ہونے لگے تو ادائے شکر کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ادائے حقوقِ الٰہی و ادائے حقوقِ عباد میں اور زیادہ توجہ و التفات شروع کر دیا جائے نہ یہ کہ انکی طرف سے غفلت برتی جانے لگے۔

یتیمِ مکّہ کی فتحِ مُبین

سرچشمۂ حق و صداقت کی پیش گوئی کے ایک حصہ کو پورا ہوتے دوست و دشمن، اب ساڑھے تیرہ سو سال سے دیکھتے چلے آرہے ہیں، لیکن دوسرا جزو بھی اپنی سچائی میں کچھ کم اثر انداز نہیں. ارشاد ہوتا ہے اور عین اس وقت کہ جوشِ مخالفت اور مخالفین کے اقتدار و قوت کا شباب ہے بے دھڑک، ..... اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ..... اور بلا جھجک ارشاد ہوتا ہے کہ ..... بے نام و نشان رہ جانے والے تیرے دشمن ہی ہیں. ..... آج ان کور باطنوں کو اپنی کثرتِ آل و اولاد پر غرہ ہے، اپنی اقبالمندی اور کامرانی کا دعوٰے ہے، اپنے پھلنے پھولنے پر ناز ہے، تیری اولاد کی وفات پر طعنہ زن ہیں کہ تو بے نام و نشان رہ گیا..... بے نام و نشان رہ جانے والا تو نہیں، بلکہ یہ خود ہیں، بے سلسلہ رہ جانے والا تیرا کام نہیں، خود ان کا کام ہے، مٹ جانے والا تیرا نام نہیں، اُن کا نام ہے. بجھ جانے والی روشنی تیری نہیں ان کی ہے اور جن کی اولادِ صلبی و معنوی نیست و نابود ہو کر رہے گی. وہ تو نہیں یہ خود ہیں. یہ مٹ جائیں گے. ان کی اولاد برباد کر دی جائے گی. ان کے گلشن تاراج کر کے رکھ دیئے جائیں گے ان کی نسلیں خاک میں ملا دی جائیں گی. یہ ناموری کے بھوکے ہیں، انھیں گمنام و بے نشان کر دیا جائیگا. تاریخ ان کے نام پر لعنت بھیجے گی، انسانیت اپنا شجرۂ نسب ان سے جوڑتے شرمائیگی. کوئی نہ ان کا نام لینے والا رہے گا نہ ان پر فاتحہ پڑھنے والا۔

دنیا نے چند ہی روز کے بعد کیا نظارہ کیا؟ اس ساڑھے تیرہ سو برس کی مدت میں کیا دیکھتی چلی آ رہی ہے؟..... ابو جہل کی قبر کا بھی کہیں نشان ہے؟..... ابولہب کا "مزار" آج تک کوئی تلاش کر سکا ہے؟..... عاص بن وائل کی اولاد آج دنیا کے کسی خطہ میں آباد ہے؟..... امیہ بن خلف کے کارناموں کی داد آج تاریخ کے کونسے طلبہ دے رہے ہیں؟..... ولید بن مغیرہ کے فضائل و مناقب کا چرچا آج کسی کی زبان پر ہے؟..... عقبہ کی اولاد آج دنیا کے کسی گوشہ میں آباد ہے؟..... رؤسائے قریش کی ریاست اور سرداران مکہ کی سرداری کی کہیں گرد تک بھی باقی ہے؟..... روئے زمین کے کسی خاندان کو آپ نے پایا ہے جو اپنا شجرۂ نسب ان باغیوں اور طاغیوں سے جوڑ رہا ہو؟

درود و سلام

انھیں بھی چھوڑیئے۔ ان کے بعد سے اس وقت تک صدیوں کے طویل و عریض زمانہ کا جائزہ لے ڈالیے۔ ہر ملک اور ہر دور کی تاریخ کو دیکھ ڈالیے' محمدؐ سے جس نے دشمنی کی' اس کا کیا انجام ہوا؟ کسی کی قسمت میں عزت و ناموری آئی؟ جس کی مدح اللہ نے کی' جسے اللہ نے "مدح کیا گیا" کہہ کر پکارا' اس کی ہجو کو جو بھی اٹھا' خود لڑکھڑا کر گرا۔ جو اس سے ٹکرایا' پاش پاش کر دیا گیا۔ جس نے اس سے گستاخی کی جرأت کی اُسے پامال کر دیا گیا۔ جسے لاولدی اور لاولدی کی بنا پر گمنامی اور بے نشانی کا طعنہ دیا گیا تھا۔ دنیا دیکھ رہی ہے اور ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے دیکھتی چلی آ رہی ہے کہ وہ سب سے زیادہ وسیع العیال اور کثیر الاولاد ہے جس کی بے کسی و گمنامی پر ہنسی اڑائی گئی تھی' وہی ناموری کا سردار' شہرت والوں کا سرتاج ہے۔ جس کے نام کو مردہ سمجھ لیا گیا تھا' اسی کے نام پر درود و سلام ہیں' اُسی کا توسل باعثِ نجات اور اُسی کا نام اللہ کے نام کے ساتھ بلند و ممتاز۔

؏

تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

میور اور مارگولیس' دہاڈسن اور سیل مغرب میں' اور ان جیسے ہزاروں اور لاکھوں

بدبخت مشرق میں مل کر اور اکٹھے ہو کر بھی، اس عزت و ناموری کو حاصل کر سکتے ہیں؟
اور اپنے نام کو، اور اپنے کام کو، مُردہ ہونے سے بچا سکتے ہیں؟

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

ڈو راستے

دو راستے

دلوں کی اقلیم میں انقلاب، منکروں کا اقرار

مہینوں کی تپش و تابش، لو اور لپٹ، تڑاتے اور جلاپے کے بعد جب برسات کی ہوائیں چلتی ہیں تو کالے کالے بادل امنڈ امنڈ کر آتے ہیں اور جل تھل بھر جاتے ہیں۔ سالہا سال کی سختیوں اور آزمائشوں، امتحانات، ابتلاآت کے بعد، جب مشیتِ مطلقہ کو، اس مشیت کو جس کے اوپر کوئی مشیت نہیں، منظور ہوا کہ مردہ میں جان پڑ جائے، اور سوکھی ہوئی کھیتی لہلہانے لگے، تو نیتوں کے رخ پلٹ دیئے اور دلوں کی اقلیم میں انقلاب برپا کر دیا۔ جو گردنیں اکڑی ہوئی تھیں، وہ جھکیں، اور جو زبانیں انکار پر اڑی ہوئی تھیں، وہ اقرار کا کلمہ پڑھنے لگیں۔ جو قلوب اپنی سختی اور قساوت میں پتھر کو شرما رہے تھے، وہ پانی ہو ہو گئے، اور جو جہنم کے شعلوں کے لئے تیار ہو رہے تھے وہ جنت کے ٹکٹ کی خریداری کو لپک لپک کر بڑھے۔ مکہ کی سرزمین جو توحید کے منادی کرنے والے پر تنگ ہو چکی تھی، اب اسی بے بس و بے کس یتیم کے جاہ و جلال، فتح و اقبال کے سامنے اپنی ساری وسعتوں اور پہنائیوں کے ساتھ پیش ہوئی، اور خانہ کعبہ کا دروازہ اسی ہجرت کر جانے والے پردیسی کے ہاتھوں، نہیں بلکہ اس کے خادموں اور خدمت گزاروں کے ہاتھوں کھل کر رہا۔ جس اللہ کا نام زبان پر لانا منع تھا، اب اسی کی بڑائی کی پکار عرب کے گوشہ گوشہ میں گونجی، اور اس کے جس بندہ کو مکہ نے حقیر جانا اور طائف نے تمسخر کیا تھا، اسی کی سچائی اور عظمت کی شہادت دینے پر اب مکہ و طائف، نجد و حجاز، یمن و عمان، دشت و جبل کے پیر و جوان، زن و مرد، غول کے غول، خیل کے خیل، جھپٹ جھپٹ کر آگے بڑھنے لگے۔ جس مجبور و بے کس کو، اپنا عزیزہ و محبوب

وطن، بالفاظِ گبن، راتوں رات صرف ایک رفیق طریق کی معیت میں چھوڑنا پڑا تھا[1]۔ وہ اس شہر میں جس کے در و دیوار تک اس کی عداوت کا عہد کر چکے تھے، اس کے آٹھویں ہی برس اس شان سے داخل ہوا کہ دس ہزار آہن پوش جاں باز اس کے جلو میں تھے اور کوکبۂ نبوی کا منظر اس جاہ و جلال کا تھا کہ بڑے سے بڑے دشمنِ اسلام کی آنکھیں خیرہ ہو ہو کر رہ گئیں۔ ایک مؤرخ ان الفاظ میں نقشہ کھینچتا ہے:

"لشکرِ اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلعم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ، ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواجِ الٰہی کا جلال اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا.... قبائلِ عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا۔ پھر جہینہ، پھر ہذیم، پھر سلیم، ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے۔ ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو ہو جاتا تھا۔ سب کے بعد

---

[1] گبن، مشہور انگریز مؤرخ ہوا ہے۔ روما کی ضخیم تاریخ میں، اسلام اور شارعِ اسلام کا بھی ذکر کیا ہے۔ واقعۂ ہجرت کے سلسلے میں لکھتا ہے:

"اب مکہ کی سرداری امیہ کے خاندان میں آئی اور ابوسفیان کو ملی، جو خاندانِ ہاشم کا جانی دشمن اور مذہبِ شرک کا زبردست علمبردار تھا۔ اس نے پیمبر کی قسمت کے فیصلے کے لئے ایک مجلس قریش اور ان کے حلیفوں کی منعقد کی.......... فیصلہ قتل کا ہوا اور قرار یہ پایا کہ ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک شخص ان کے قلب میں تلوار بھونکے تاکہ قصاص لینا بنی ہاشم کے لئے آسان نہ رہ جائے۔ کسی فرشتہ یا جاسوس نے سازش کی مخبری کر دی۔ اب پیمبرؐ کے لئے بجز ترکِ وطن کے کوئی چارہ نہ تھا۔ رات کی تاریکی میں محض ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر چپکے سے اپنے گھر سے نکلے۔" (باب ۵۰)

مکہ میں فاتحانہ داخلہ بھی اسی کی زبان سے سنیئے۔ ....

"جوش و خروش اور نظم و باقاعدگی نے کوچ کو بھی جاری رکھا اور راز کو بھی قائم رکھا۔ تا آنکہ دس

(باقی اگلے صفحے پر)

انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا:

"یہ کون لشکر ہے؟"

حضرت عباسؓ نے نام بتایا۔ دفعتہً سردارِ فوج حضرت سعد بن عبادہؓ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے:

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ

آج گھمسان کا دن ہے آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطحِ خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام علمبردار تھے۔"

(سیرۃ النبی۔ شبلی۔ جلد اوّل ص ۳۷)

باطل کی سرداری ختم

چند سال کے اندر، دیکھتے دیکھتے دنیا کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ اب راج تھا تو مکہ کے اُسی اُمی کا، اور جیت تھی تو بنی ہاشم کے اُسی یتیمؐ کی۔ ابوجہل کی مختاری، عتبہ کی سرداری، ابولہب کی ریاست، سب نسیاً منسیاً ہو چکی تھی، اور عاص بن وائل، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ کے بھائی اور بھتیجے، بیٹے اور پوتے، اگر کہیں تھے تو اس آرزو و تمنا میں دوڑتے ہوتے کہ اللہ کے رسولؐ کی رکابوں کو چومیں اور خاکِ پا کو آنکھوں سے لگائیں۔

نصرتِ الٰہی

یہ عجیب و غریب نظارہ، عالم رویا و منام میں نہیں، نگاہ کشفی و عرفانی سے نہیں، اسی

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہزار تلواروں کی چمک دمک نے حیرت زدہ قریش کو پُرقوت دشمن کی آمد پر چونکا دیا۔ مغرور ابوسفیان نے شہر کی کنجیاں لا کر حوالہ کر دیں اور اس کے سامنے سے پرچموں اور ہتھیاروں کے جو جلوس پر جلوس گزر رہے تھے، انھیں دیکھ دیکھ عش عش کرتا رہا۔ (ایضاً)

عالم حس و بیداری، انہی مادی آنکھوں سے دکھایا گیا۔ اور دکھانے کے ساتھ ہی جتا بھی دیا گیا کہ یہ جو کچھ ہوا، محض نصرتِ الٰہی سے ہوا، نصرت کا وعدہ شروع ہی سے تھا۔ نصرت علم باری میں مقدر ہو چکی تھی۔ جب اس کی گھڑی آئی، نصرت اپنے عین وقت پر ظاہر ہو کر رہی[1]..... اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ..... ورنہ کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی اپنے عزم و ہمت، اپنی سعی و زورِ بازو سے ممکن نہ تھا کہ اتنا زبردست و عظیم الشان انقلاب پیدا کر سکتا، اور فتح اسی نصرتِ الٰہی ہی کے نتیجہ کے طور پر ظاہر ہو کر رہی۔ نصرت کا رنگ تو لطیف اور خفی ہوتا ہے، اس کا ادراک تو صرف صاحب بصیرت ہی کر سکتے تھے۔ فتح کا ظہور ایسا مادی اور اس قدر نمایاں اور کھلا ہوا ہو کر رہا کہ عامی سے عامی نے بھی اسے دیکھا اور غبی سے غبی بھی اس کو سمجھ کر رہا[2]۔ پھر نری "فتح" تو دوسروں کے لئے بھی ممکن ہے۔ جسموں کے فاتح تو دنیا میں اور بھی ہوتے ہیں۔ یہ نبی کی فتح تھی۔ اللہ کے سب سے بڑے پرستار کی فتح تھی۔ سکندر اور چنگیز، نپولین اور ھنڈن برگ کی فتح نہ تھی۔ یا دیہ نہیں دلایا جاتا کہ ملک کا رقبہ اتنا وسیع ہوا، خراج کی

---

[1] ومعنی مجیئ النصر ان جمیع الامور مرتبطۃ باوقاتھا یستحیل تقدمھا عن وقتھا او تأخرھا عنہ فاذا جاءت الوقت المعین حضر معہ ذلک الامر المقدر (خازن) وانما عبر عن الحصول بالمجیئ تجوزا للاشعار بان المقدرات متوجھۃ من الازل الی اوقاتھا المعینۃ لھا فتقرب منھا شیئا فشیئا۔ (بیضاوی)

[2] فتح عربی میں چیز کے کھل جانے اور دشواری کے حل ہو جانے کو کہتے ہیں۔ الفتح ازالۃ الاغلاق والاشکال.. راغب نے لکھا ہے کہ اس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مادی آنکھوں سے نظر آتی ہے، مثلاً دروازہ کا کھلنا، قفل کا کھلنا وغیرہ۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو صرف چشم بصیرت سے نظر آتی ہے۔ پھر خود اس کی متعدد قسمیں ہیں۔ اور ہر معنی کے استشہاد میں کلام مجید کی آیات پیش کی ہیں۔ اور سورۃ الفتح میں فتح مبین سے مراد علوم و ہدایات نبوی سے لی ہے۔ عنی ما فتح علی النبی من العلوم والہدایات التی ھی ذریعۃ الی الثواب والمقامات المحمودۃ۔

رقم میں اتنے کا اضافہ ہوا۔ "رعایا" کی گنتی اتنی بڑھی، بلکہ مخاطب کے خاص مذاق پیمبری کی رعایت سے ارشاد یہ ہوتا ہے کہ اس فتح کے آثار میں تم نے سب سے بڑا اور نمایاں اثر یہ دیکھ لیا کہ .....

ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً ..... جس دین میں شامل ہوتے لوگ اکا دکا بھی ڈرتے تھے، اس میں اب فوج کے فوج، جوق در جوق گھرانے کے گھرانے، محلہ کے محلہ، قبیلہ کے قبیلہ، کھلے خزانے، ہانکے پکارے، بے دھڑک اور بلا جھجک شامل ہو رہے ہیں اور شامل کاہے کو ہو رہے ہیں، کسی انسانی جتھے کی تقویت کے لئے نہیں، قبیلہ، قوم، ملک، رنگ، نسل، وطن کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے نہیں، "نیشنلزم" کے نام پہ جینے اور مرنے کے لئے نہیں بلکہ فی دین اللہ، محض اللہ کے نام کی پاکی اور بلندی کے لئے، توحید کی پرستاری کے لئے۔ لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں، ہتھیار نہیں رکھ رہے تھے، سیاسی محکومی کے اقرار نامے نہیں لکھ رہے تھے، مسلمان ہو رہے تھے، توحید کا کلمہ پڑھ رہے تھے، نجات و غفران کے پروانے حاصل کر رہے تھے۔ اور کل تک جس نورِ حق کے خون کے پیاسے تھے آج اسی شمع کے گرد پروانہ دار خود نثار ہو جانے کو آگے بڑھ رہے تھے۔ دنیا نے "فتوحات" بہت سی دیکھی ہیں، ایسی حیرت انگیز "فتح" بھی چشمِ تاریخ نے کہیں دیکھی ہے؟ اس عجیب و غریب فتح کو بجز نصرتِ الٰہی کے اور کسی شے پر محمول کرنا ممکن ہے؟

دنیا جب فتح مند ہوتی ہے تو عام طور پر کیا کرتی ہے؟ اچھلتی ہے، کودتی ہے، ناچتی ہے، گاتی ہے، باجہ بجاتی ہے، جشن مناتی ہے، کھاتی ہے، کھلاتی ہے، پیتی ہے، پلاتی ہے، یہ "فتح" جس طرح اپنی ذات میں بے نظیر تھی، اپنے ثمرات و عواقب کے لحاظ سے بھی بے نظیر رکھی گئی۔ حکم یہ نہیں ملتا کہ اس فتح کی خوشی میں شہر کو چراغاں کیا جائے، کوئی جلوس نکالا جائے، جلسے اور مظاہرے کر کر کے تجویزیں پاس کی جائیں، بلکہ ارشاد یہ ہوتا ہے کہ اے پیمبرؐ! اب دین کی تکمیل ہو چکی، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ[1] اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا فرائض نبوت تمام ہو چکے، پیام کی منادی تم کر چکے، حق کے لئے اور خالق کے حکم سے، خلق کی جانب

---

[1] استغفار کے معنی، لغت میں، حفاظت طلب کرنے کے بھی آ رہے ہیں۔ بعض (باقی اگلے صفحہ پر)

اپنے دل پر جبر کر کے بہت رجوع رہ چکے، بس اب وقت ہے کہ اپنے اصلی ذوق کے مطابق، صورۃً بھی تمامتر حق ہی کی طرف رخ کرلو، خالق ہی کی جانب رجوع ہو جاؤ، اسی کی حمد کی تسبیح میں لگ جاؤ، اسی سے استغفادہ شروع کر دو، اسی سے اپنی حفاظت کی دعائیں کرنے لگو، لہ وہ تمہارا رب، جو ہمارا، اور سب کا مربیٔ حقیقی ہے، بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا، بڑا ہی رجوع برحمت کرنے والا ہے۔

تعمیل کی شان

سبحان اللہ، کیا شان بے نیازی ہے، اور کس درجہ تکمیلِ عبدیت مقصود ہے۔ استغفار کا حکم اسے مل رہا ہے، جو خود دوسروں کی مغفرت کرائے گا، اور توبہ قبول ہونے کی بشارت اُسے دی جا رہی ہے، جو معصوم ہی نہیں، معصوموں کا سردار ہے۔ لیکن صلّ علیٰ، بندہ بھی کیسا تھا، اپنے مولا کا عاشقِ زار، حکم کی تعمیل معناً تو جس طرح کی ہوگی، اس کا حال اہل معنیٰ ہی جان سکتے ہیں، لفظاً اس طرح کی، کہ اٹھتے اور بیٹھتے، اور آتے اور جاتے، کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ زبان سبحان اللہ وبحمدہٖ کے ورد سے نا آشنا رہنے پائی ہو لہ اور کلمات استغفار کی کثرت اس کے علاوہ تھی احکام میں،

(گزشتہ سے پیوستہ) نے استغفار سے امت کے لئے استغفار مراد لیا ہے۔

لہ شعبی عن ام سلمۃ قالت کان رسول اللہ صلعم فی آخر امرہ لایقوم ولا یقعد ولا یذھب ولا یجیئ الا قال سبحان اللہ وبحمدہٖ فقلت یا رسول اللہ انک تکثر من سبحان اللہ وبحمدہٖ لا تذھب ولا تجیئ ولا تقوم ولا تقعد الا قلت سبحان اللہ وبحمدہٖ قال انی امرت بھا فقال اذا جاء نصر اللہ الیٰ آخر السورۃ (ابن جریر)

لہ مسروق عن عائشۃؓ قالت ما صلی النبی صلعم صلاۃ بعد ان نزلت علیہ اذا جاء نصر اللہ والفتح الا یقول فیھا سبحانک ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی۔ (صحیح بخاری)

مخاطب گو پیمبر ہوتے ہیں لیکن مراد امت ہوتی ہے۔ جب فتح و نصرت، غلبہ و کامرانی کے موقع پر، رسول تک کو حکم تسبیح و استغفار کا ہے[1]۔ تو غیر معصوم افرادِ امت کے لئے ان احکام کی تعمیل کتنے زائد درجوں میں ضروری ہوگی!

حق پرستوں کا راستہ

ایک راستہ یہ تھا، یہ حق پرستوں کا راستہ تھا۔ صرف "تھا"۔ یہ صیغۂ ماضی نہیں، "ہے"۔ یہ صیغۂ حال بھی، جس طرح ہمیشہ کھلا ہوا تھا، آج بھی کھلا ہوا ہے۔ حق کی پرستش بیکار نہیں جاتی۔ اور راہ کی منزلیں کتنی ہی دشوار گزار، اور آزمائشیں کیسی ہی سخت ہوں، آخری فلاح و کامیابی حق پرستوں ہی کو ہو کر رہتی ہے۔ قرآن پاک، واقعاتِ تاریخی کا رجسٹر نہیں، ہدایت و رہنمائی کا نسخہ ہے، دنیا کے سارے حق پرستوں کے سردار کی سرگزشت سنا کر جتا دیا کہ راہ حق پر چلنے والوں کے لئے یہ نقشۂ تقدیر ہے۔ پہلے "عسر" پھر "یسر"۔ پہلے بے کسی و بے بسی، پھر قوت و عظمت۔ پہلے یتیمی و بے سامانی، پھر غلبہ و کامرانی۔ پہلے ہجرت، پھر فتح و نصرت۔ شرط صرف یہ ہے کہ حرا کی غار نشینی نظر انداز نہ ہونے پائے اور سخت سے سخت بے چارگی میں۔۔۔۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔۔۔۔ کہنے والے کی طرح "کسی" کی معیت کا سررشتہ تصور ہاتھ سے نہ چھوٹنے۔

خود پرستی کا راستہ

لیکن دنیا میں یہی ایک راستہ نہیں۔ ایک دوسرا راستہ ٹھیک اسی کے مقابل، مادیت اور خود پرستی کا ہے۔ یہاں توکل علی اللہ پر قہقہے لگائے جاتے ہیں اور اعتماد اپنی قوت پر کیا جاتا ہے۔ یہ راہ خودی کی ہے، یہ راہ دولت و حکومت، جاہ و ثروت، عزت و وجاہت والوں کی ہوتی ہے۔

---

[1] ایک جماعت مفسرین کا خیال ہے کہ استغفار کا جو حکم رسولؐ کو ملا ہے اس سے مراد امت کے لئے استغفار ہے۔۔۔۔ وقیل استغفرہ لامتک (بیضاوی)۔۔۔۔ وقیل المراد منہ الاستغفار لذنوب امتہ وھذا ظاھر (خازن)

یہاں کامیابی نتیجہ سمجھی جاتی ہے زرپاشی کا' پارٹی بندی کا "خوش تدبیریوں" کا۔ مہذب دور کی مہذب اصلاح میں "کنویسنگ" کا۔ ہر نور' اپنے مقابل' ٹھیک اسی درجہ کی ظلمت کو چاہتا ہے۔ مکہ کا یتیم' جو خیرِ محض' نورِ مجسم بنا کر بھیجا گیا' اس کے مقابلہ پر' جو شرِ محض' ظلمتِ مجسم بن کر اٹھا' وہ نسباً و قرابتہً کوئی غیر نہیں' اوروں سے بڑھ کر اپنا' یعنی اس داعیِ حق کا چچا ہے۔ ریاستِ مکہ کا رئیس ہے' صرف دنیوی ہی نہیں بلکہ دینی بھی۔ اہلِ مکہ کا لیڈر رہے۔ اور خانۂ کعبہ کا متولی۔ اس کے جاہ داثر' اقتدار و وجاہت کا کیا پوچھنا ادھر صفا کے ٹیلے پر چڑھ کر پیغمبرِ برحق نے' اپنے عزیزوں قریبوں کو اپنا پیام سنانا چاہا' کہ ادھر اس دشمنِ حق نے اپنے ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوسا کہ :

"اے محمدؐ! تو ہلاک ہو' کیا تو نے ہمیں بس اسی کے لئے اکٹھا کیا تھا!"

اور اس وقت سے یہ شیوہ ہو گیا کہ جدھر جدھر وہ حق کا راہبر اپنے وعظ و پند کے لئے رخ کرتا تھا' اسی طرف یہ ظالم بھی اپنی قوت و اقتدار کی پوری نمائش کے ساتھ سدِ راہ بن کر ساتھ ہو لیتا تھا۔ اب حق و باطل کا معرکہ اپنے شباب پر تھا' اور باطل اپنی تائید پر ساری ظاہری و مادی قوتوں کے اجتماع کے ساتھ غلبہ پاتا نظر آ رہا تھا۔ عین اس وقت جب کہ حق کی بیچارگی اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور حق کے پرستار پر معلوم ہوتا تھا کہ زمین' آسمان سب تنگ ہو چکے ہیں[1]۔ اعلان ہوتا ہے اور بلا کسی جھجک اور رکاوٹ کے' پُر زور اعلان ہوتا ہے کہ یہ جوشِ مخالفت اور آتشِ عداوت سے بھرا ہوا شخص' جو اپنے انجام کی تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ..... مناسبت سے اسی دنیا میں ابولہب (شعلہ والا) کے نام سے مشہور ہو چکا ہے' ہلاک ہو گیا اور اس کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے۔ جو ہاتھ مخالفتِ حق میں اس قدر سرگرم ہیں اور جنہیں اٹھا اٹھا کر اس بدبخت نے کوسا تھا' وہ خود ٹوٹ کر رہ گئے۔ اس کی کوششوں اور سازشوں پر پانی پھر گیا۔ ان کی کمیٹیاں اور کانفرنسیں کچھ کام نہ آئیں۔ اس کے

---

[1] سورۂ لہب کے نزول کا زمانہ ابتدائی زمانہ ہے۔ جب ذاتِ مبارکؐ ہر طرح نرغۂ اعداء میں محصور تھی' اور غلبہ کی ساری نشانیاں ابوجہل و ابولہب کے ساتھ تھیں۔

توڑ جوڑ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس کا پروپگینڈا خود اسی کے منہ پر الٹا پڑا۔ اس کو بڑا دعوےٰ اپنے زر و مال کا اور بڑا نشہ اپنی زرپاشیوں کا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز اس کے آڑے نہ آئی' نہ اس کی مَا اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ..... جا ئما دلسے ہلاکت اور بربادی سے بچا سکی نہ اس کی سرمایہ داری۔ انجام اس کا خسران ہوا۔ اس کی ہر تمنا ناکام اور ہر کوشش رسوا ہو کر رہی۔

ابولہب کی ناکامیاں' کاتب تقدیر کا فرمان

پیش گوئی' کسی شاعر کا تخیل نہ تھا' کاتب تقدیر کا فرمان تھا حرف حرف پورا ہو کر رہا۔

چند ہی سال کی مدت میں آسمان کے نوریوں ہی نے نہیں' زمین کے خاکیوں نے بھی دیکھا کہ یہ خوش اقبال رئیس مکہ و بلند بخت امیر قریش' اپنے ہر منصوبہ میں ناکام و نامراد' ہر طرح پر خائب و خاسر' اپنے کلبۂ احزان میں' ایک وبائی جلدی مرض میں مبتلا' رفیقوں اور دوستوں کی دلدہی اور عزیزوں قریبوں کی تیمار داری سے محروم' تن تنہا بستر مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا ہے۔ اور مرنے کے بعد جب جسم بالکل سڑ جاتا ہے اور عفونت دور دور پھیلنے لگتی ہے تو حبشی' لاشہ بے کفن کو گھسیٹ کر ایک گڑھے میں ڈال آتے ہیں' اور یہ ٹھیک وہ وقت ہوتا ہے جب وہ مکہ کا بھیے یار و' یتیم' بدر کے میدان میں ابوجہل اور اس کے ساتھ کے بڑے بڑے گردن کشوں کا خاتمہ کر کے' اپنے صدہا جاں نثاروں کے جلو میں' فاتحانہ و شاہانہ جاہ و جلال سے مدینہ کے اندر' اپنے ہزارہا فدائیوں کی آبادی میں داخل ہو رہا ہے —— ساڑھے تیرہ سو سال گزر چکنے کے بعد (ہجرت کا سنہ' عین ابولہب کے ظلم کی تاریخ ہے) اب عقیدت مندی سے نہیں' تاریخ سے سوال ہے کہ ابولہب کی عظمت کہاں ہے؟ اس کا نام کس کی زبان پر ہے؟ اس کی اولاد دنیا کے کس گوشہ میں آباد ہے؟ اس کے نام پر نوحہ خواں کس کس دیس میں بستے ہیں؟ اس کی قبر کا نشان دنیا کے کسی محکمۂ آثار قدیمہ نے ڈھونڈ نکالا ہے؟

انجام عاجل یہ ہوا۔ اب انجام آجل کی بھی خبر سن لیجئے۔ دنیا یوں گئی' آخرت کو بھی جاتا ہوا اب دیکھ لیجئے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ ابھی ہؤا ہی کیا ہے' یہ تو نمونہ تھا۔ اس ابدی حرمان ۔۔۔۔۔ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۔۔۔۔۔ اور دائمی خسران کا جو آگے پیش آکر رہتا ہے' آ رہا ہے' وہ وقت جب اس بدنصیب کے اندر کی آگ اسے باہر سے بھی گھیر لے گی۔ اور اپنے نام کی طرح جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان یہ پھینکا جائے گا۔ اس کی جیتے جی بندیاں جب دنیا ہی میں اسے نہ بچا سکیں تو وہاں کیا کام آئیں گی۔ اور یہ صاحب وہاں تنہا نہ ہوں گے بلکہ مع اپنی لیڈی صاحبہ کے ہوں گے۔ ان لیڈی صاحبہ کے اوصافِ حمیدہ یہ ہیں کہ یہاں دنیا میں ادھر کی اُدھر لگا کر' دلوں میں رنجش اور عداوتیں پیدا کرتی رہتی ہیں' اور اپنے شوہرِ نامدار کی آتشِ بغض و فساد کے شعلوں کو' ایندھن ڈال ڈال کر اور بھڑکاتی رہتی ہیں' اور ایمان والوں کی راہ میں ایذا رسانی کے لئے کانٹے بچھاتی رہتی ہیں' وہاں ان کی "خوش گوئی" (Society- gossip ——) کچھ کام نہ دے گی۔

آج اس سیہ بخت عورت کو اپنے قیمتی زیوروں پر غرّہ ہے' اور اپنی گردن کا طلائی ہار' یہ اللہ کی چہیتی امت' مسلمانوں کی مخالفت میں لگا دینا چاہتی ہے۔ کل اس کی اسی گردن کو موٹے رسی سے گھسیٹ گھسیٹ کر' اسے اسی آگ میں جھونکا جائے گا۔ اور یہی دنیا میں حق کے دشمنوں کا انجام ہؤا ہے۔

ایک راستہ وہ تھا' دوسرا راستہ یہ ہے۔ ایک میں آگے بڑھ کر فتح و نصرت کی کشادگیاں ہیں' اور فضل و کرم کی بہار آرائیاں۔ دوسرے کا خاتمہ تباب و ہلاکت" تباہی و بربادی' حرمان اور خسران پر آکر ہوتا ہے۔ پہلا راستہ ترکِ خودی کا ہے' دوسرا خودی کا۔ پہلی راہ' اللہ والوں کی' اللہ کے مقبولوں کی' عجز و شکستگی اختیار کرنے والوں کی ہے۔ دوسری خود پرستوں کی' زر والوں کی' اور زور والوں کی' دانش و فرزانگی کے مدعیوں کی' حکمت و تدبیر پر مغروروں کی۔ دونوں راہیں تشریعاً ایک دوسرے کی ٹھیک ضد ہیں' اور عین مقابل۔ لیکن حکمت تکوینی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو نور و ظلمت' خیر و شر کی طرح ایک دوسرے کی متمم و مکمل' اور ایک دوسرے کے لئے مایۂ حیات اور صورتِ معنیٰ۔ ایک سورۂ قرآنی' ایک راستہ دکھانے والی' دوسری' دوسری راہ

ہوشیار کر دینے والی۔ دونوں کے زمانۂ نزول کے درمیان سالہا سال کا فرق۔ لیکن ترتیب اور نظمِ قرآنی کے اعجاز پر ایک مستقل گواہ کی حیثیت سے دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو۔

سورۂ کافرون کے آخر میں آتا ہے:

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ

"اے کافرو! تمہارا دین تمہارے ساتھ اور میرا دین میرے لئے۔"

ترتیب قرآنی میں اس کے معاً بعد سورۂ نصر، آخری ٹکڑے وَلِيَ دِينِ (میرے دین) پر کی شارح، اور اس سے متصل سورہ لہب، پہلے ٹکڑے لَكُمْ دِينُكُمْ (کافروں کے دین) کی ترجمان!

ذکرِ رسولؐ کی بلندی

نشستم بانکویان فرنگی
ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

—— اقبالؒ

ذکرِ رسولؐ کی بلندی

مثلِ آفتاب خادموں کا سرمایۂ ناز

کروڑوں تو شاید، لیکن لکھوکھا بندے اللہ کے یقیناً ایسے ملیں گے، جو اپنی نجات اور اپنی عقبیٰ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات سے وابستہ مجبور رہے ہیں، اور آج ہی نہیں، سینکڑوں برس سے سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ عقیدہ کی صحت وغلطی سے یہاں بحث نہیں، مقصود نفس واقعہ کا اظہار ہے ان کی زبانوں پر نام ہے تو غوثِ اعظمؓ کا، اور دلوں میں اعتقاد ہے تو محبوب سبحانیؒ کا۔ لیکن ذرا سوچ کر بتایئے کہ شیخؒ اور ان کے سارے پیشرو اور پس رو، حسن بصریؒ اور جنید بغدادیؒ، خواجہ اجمیریؒ اور سید احمد سرہندیؒ، نظام دہلویؒ اور علاء الدین صابر کلیریؒ، نازاں کس شے پر ہیں؟ اپنی سروری وسرداری پر یا عرب کے اُمّیؐ کی غلامی پر اور مکہ کے یتیمؐ کی چاکری پر؟ . . . . اللہ اللہ! جو خود لاکھوں کے سردار اور کروڑوں کے پیشوا، انھیں اگر فخر ہے تو صرف اس کا کہ کسی آستانِ پاک کے جاروب کش ہیں، اور بس ـــــ دنیا میں اب تک بڑے بڑے جوگی اور رشی راہب اور اہلِ ریاضت گزرے ہیں، یہ امتیاز اور یہ اعزاز کسی اور کے حصہ میں آیا ہے؟ کسی کے خادموں میں بھی ایسے ایسے آفتاب اور ماہتاب، اور وہ بھی اس کثرت سے ہوئے ہیں؟

بے نظیر خدمت اور خادم

امام بخاریؒ کے مرتبہ وعظمت سے کون ناواقف ہے۔ ان کی کاوش وتحقیق کی نظیر کسی ملک، کسی قوم میں ملتی ہے؟ پھر انھوں نے اور انھیں کی راہ پر دوسرے صدہا چلنے والوں نے، امام مسلمؒ نے

امام مالکؒ نے، امام ابوداؤدؒ نے، امام ترمذیؒ نے، امام نسائیؒ نے اپنی ساری ساری عمریں کس شغل کی نذر کردیں؟ محض ایک ہی ﷺ کے اقوال واعمال کے جمع کرنے میں۔ اور عسقلانی اور عینی، قسطلانی اور طیبی، سخاوی اور شوکانی قاضی اور نودی اور ان جیسے سینکڑوں دوسروں نے اپنی زندگیوں کو کس چیز کے لئے وقف کر رکھا ہے؟ اسی امیؐ کے اقوال کی شرح وتفسیر، اور اس کی جانب منسوب الفاظ کی تنقیح وتنقید کے لئے۔ ابن جوزیؒ اور ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ (ان کی ساری زندگیوں کی تحقیق وتدقیق کا خلاصہ کیا ہے؟) بس اسی قدر نا، کہ فلاں فلاں بدعتیں اس امیؐ کی سنت کے مخالف ہیں، اور فلاں فلاں اقوال اس کی جانب منسوب کرنا اس پر افترا کرنا ہے۔

اس پردۂ عالم پر ایک سے بڑھ کر ایک عالم وفاضل، حکیم وفلسفی، ادیب وہندسی پیدا ہو چکے ہیں۔ دنیا نے اب تک ان میں سے کسی کے ساتھ، اس کا نصف بھی اعتنا کیا ہے؟ کسی افلاطون، کسی سقراط، کسی ارسطو، کسی نیوٹن، کسی کینٹ، کسی ڈارون کے اقوال وملفوظات، اس کاوش کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں؟ کسی کا ایک ایک فقرہ، ایک ایک قول، ایک ایک لفظ اتنی سخت جرح اور ایسی ایسی موشگافیوں کے بعد، پاکوں کے واسطے سے اور سچوں کی شہادت سے یوں سلسلہ بہ سلسلہ منقول ہو کر پہنچا ہے؟

نقوشِ سیرت کی حفاظت

ابن اسحاق اور ابن ہشام، سہیلی اور زرقانی، ابن سعد اور قاضی عیاض ومیاتی اور مغلطائی اور ان کے صدہا شاگردوں اور رفیقوں کے ضخیم مجلدات آپ کی نظر سے اگر نہیں گزرے، نہ سہی، ان کے ناموں کی شہرت تو یقیناً آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہوگی۔ ان کا مشغلۂ زندگی کیا رہا؟ یہ کا ہے میں جئے اور کا ہے میں مرے؟ اسی امیؐ معلم کائنات کی سیرت کا ایک ایک گوشہ محفوظ رکھنے میں، اس کی کتاب زندگی کی ایک ایک سطر حفظ کرنے میں۔ اور محض یہی نہیں "روشن خیال" میور اور "علم دوست" مارگولیس "تحقیق پسند" کارلائل اور "حقیقت طراز" ولہاوسن کو کس کے سوانح نویسوں کی صف میں شمار ہونے کی آرزو بیقرار کئے ہوئے ہے۔ دنیا میں بڑے بڑے گردن کش بادشاہ اور تاجدار ہو چکے ہیں۔ کسی کی سیرت، اس تحقیق اور اس جزئی تفصیل کے ساتھ،

تاریخ کے صفحات میں کہیں بھی ملے گی؟ کسی فرعون، کسی نپولین، کسی سکندر، کسی زار، کسی قیصر، کسی دارا، کسی فغفور، کسی سلطان، کسی مہاراجہ، کسی ہز میجسٹی کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا، پینا، ہنسنا، رونا، لیٹنا، بولنا، اس جامعیت، اس استقصار، اس تاریخیت اور اس اہتمام کے ساتھ کاغذ کے نقوش پر آج تک منتقل ہو سکا ہے؟

اُمّیؐ کی شریعت کے شارح، اُسکی وسعت

امام ابو حنیفہؒ کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے۔ کون دل ہے جو آپ کی عظمت سے خالی ہے؟ آپ خود الگ رہے، ان کے شاگرد، بلکہ ان شاگردوں کے شاگرد، اس پایہ کے تھے کہ معاصرین نے انھیں امام وقت تسلیم کیا، لیکن خود یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ اور ان کے احباب و رفقاء و تلامذہ، سفیان ثوریؒ اور اوزاعیؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ، زفرؒ اور حسنؒ، حمادؒ اور مزنیؒ، طحاویؒ اور سرخسیؒ اور صدہا ہزارہا فقہا، جو اب تک ہو چکے ہیں، یہ آخر گروہ در گروہ، انبوہ در انبوہ، کرتے کیا رہے ہیں۔ اسی ان پڑھ کے لائے ہوئے قانون کی شرح و تفسیر، اور اسی حرف ناشناس کی بتائی ہوئی شریعت کے فروع کا حل اور جزئیات احکام کا استنباط۔ دنیا میں آخر اور بڑے بڑے امیر، وزیر، قانون ساز، قانون گر، مدبرین سلطنت گزرے ہیں، کیا ان میں سے کسی کو ایسے اور اتنے شارحین نصیب ہوئے ہیں؟ یونان، ہندوستان، مصر وغیرہ کو چھوڑیئے، روم کو لیجئے کہ اس کا "رومن لا" آج خدا معلوم کتنے دماغوں کو مرعوب کئے ہوئے ہے، جو بسط و وسعت اسلامی فقہ کو حاصل ہے، "رومن لا" غریب کو اس کا عشر عشیر بھی تو نصیب نہیں ہے۔

نعت گو شعراء

مثنوی شریف آج بھی کتنے دلوں کو مست کئے اور کتنی محفلوں کو گرمائے ہوئے ہے۔ یہ مولانائے رومی اور خواجہ حافظ، سعدی شیرازی اور نظامی گنجوی، خسرو اور جامی، سنائی اور عطار، صدیوں سے کس کے نام پر سر دھن رہے ہیں؟ کس کے پیام کی ترجمانی کر رہے ہیں؟ کس بڑے کا

سہارا پکڑ کر خود بھی بڑے بن چکے ہیں؟ وہی بادیۂ عرب کا بوریہ نشین، جو شاید شعر موزوں پڑھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور جس کے لئے شاعری موجبِ فخر نہیں، باعثِ ننگ تھی..... وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ ..... دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں نے آج تک کس کا اس طرح استقبال کیا ہے؟ کس بادشاہ کی شان میں اس عقیدت قلب کے ساتھ، اس ارادت و خلوص کے ساتھ، اس سوز و گداز کے ساتھ، قصائد لکھے ہیں؟ کسے یوں بیتاب ہو ہو کر پکارا ہے؟ ہومر کے، امراء القیس کے، فردوسی کے، والمیک کے، شیکسپیر کے، ملٹن کے، گیٹی کے، کالیداس کے، کسی خطہ اور کسی زمانہ کے شاعر کے نام کو، پیام کو، کلام کو یہ مقبولیت، یہ مرتبہ نہ سہی، اس کا آدھا، چوتھائی، دسواں حصہ نصیب ہوا ہے؟

کس شمع کے پروانے تھے

عمر فاروقؓ اور علی مرتضٰیؓ کے نام سے کیسے کیسے سورماؤں کے کلیجے دہل دہل کر رہے؟ خالد سیف اللہؓ کی شمشیر اور ابن عاصؓ کی تدبیر نے پتھروں کو پانی کر کے بہا دیا، لیکن یہ سب خود، کس شمع کے پروانے تھے؟ کس کے آستانہ پر جبیں سائی سے رفعتیں اور بلندیاں حاصل کرتے رہے؟ ہارون اور مامون، سلجوق اور دیلم، غزنوی و غوری، تیمور و بایزید، عثمان و سلیم، طارق و قاسم، لودی و خلجی، تیمور و بابر، ہمایوں و جہانگیر، شاہجہاں و اورنگ زیب، کس کی خاک بوسی کو، سدا اپنے لئے معراج کمال اور وسیلۂ نجات سمجھے؟ دکن کا موجودہ صاحبِ سریر کس کے اشتیاق و تمنا میں گرم آنسو بہاتا اور سرد آہیں بھرتا رہتا ہے؟ بے سروسامان ریفیوں نے کس کے دین کی غیرت میں اسپین اور فرانس، دو دو سلطنتوں کا چیلنج قبول کر لیا؟ انور نے کس کی امت کی خاطر جان تک نذر کر دی؟ محمود الحسن کو کس کے نام کی عزت و ناموس نے در در پھرایا؟ گھر سے بے گھر کرایا، نظر بند کرایا؟ محمد علی کس کی امت کے غم میں دیوانہ وار جلا وطن ہوا، نظر بند ہوا، جیل میں کئی کئی سال کاٹے؟ سب کے جواب میں ایک بار پھر اسی عبداللہ کے لختِ جگر اور آمنہ کے نورِ نظر کا نام لیا جائے گا، یا کسی اور کا۔

بے نظیر علم کلام، کس کے پیام کے لیئے

غزالی کی تصانیف پر خود انھیں رشک آگیا ہے، جن پر ہم آپ دن رات رشک کرتے رہتے ہیں۔ بہ قول جارج ہنری لیوس (صاحب تاریخ فلسفہ) کے "اگر غزالی کی تصانیف کا ڈیکارٹ کے وقت تک ترجمہ ہو گیا ہوتا تو لوگ ڈیکارٹ کے فلسفہ کو غزالی کا سرقہ ہی سمجھتے۔ یہ غزالی اور ان کے آثارِ قدم پر چلنے والے، شاہ ولی اللہ دہلوی اور حکیم الامت اشرف علی تھانوی وغیرہ ہم نے علم اسرار الدین اور معالجۂ امراضِ نفسانی پر جو دفتر کے دفتر تیار کر دیئے ہیں، ان کا حاصل اور لب لباب کیا ہے، بس اسی نبی اُمیؐ کے لائے اور پھیلائے ہوئے دین کی حمایت و نصرت، اور اس کی تبلیغ و ترویج۔ ابوالحسن اشعری اور ابو بکر باقلانی، رازی اور آمدی، نسفی اور جرجانی نے عقائد و کلام میں تصانیف کا جو انبار لگا دیا، اور ان کے جانشین جس طرح ہر دور میں پیدا ہوتے رہے، یہاں تک کہ آج چودھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی جو کام ہو رہا ہے، اس پایہ کا علم کلام کسی شخصیت کے اردگرد پیدا ہو سکا ہے؟ کونسی تاریخی ہستی اتنا زبردست اور اس قدر وسیع کلامی لٹریچر پیدا کرا سکی ہے؟

تفسیر کے میدان میں رجعت

مفسرین کرام کے نام اور ان کے کارنامے کس پر روشن نہیں؟ تابعین میں ضحاک اور قتادہ مجاہد اور ابن زید نے معانی قرآن کی جو خدمت کی، اس کا صلہ کس کے امکان میں ہے۔ ابن جریر کے تیس مجلدات کو کون بھول سکتا ہے۔ ابن کثیر کی کاوش و جستجو کی داد کون دے سکتا ہے۔ بیضاوی و زمخشری کی قدر کس کے دل میں نہیں۔ بغوی اور نسفی، ابن حیان اور ابو سعود نے اپنی عمریں اسی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ چشم تصور دیکھ رہی ہے کہ یہ سب کے سب اپنے اپنے مجلدات و اسفار لیے ہوئے، ایک اُمیؐ کی خدمت میں دست بستہ اس کی نگاہِ کرم کے منتظر کھڑے ہوئے ہیں اور ان کی بڑی سے بڑی آرزو ہے تو یہ کہ اس کے قدموں پر نثار ہو جائیں۔

نحو و لغت، خدمت نبیؐ کی ایک صورت

نحو و لغت کی طرف آیئے تو ایک سے بڑھ کر ایک امام فن نظر آئیں گے، ایسے کہ ح . . . ، . . ، . ، . ، . ، .

ہے۔ کسائی اور ابوالاسود دوئلی، خلیل اور سیبویہ، ابن مالک اور ابن حاجب، ابن درید و ابن سیدہ، زمخشری و مطرزی، جوہری و فیروز آبادی، ابن منظور و زبیدی۔ کسی نے صرف پر لکھا اور کسی نے نحو پر، کسی نے لغت کو اپنا موضوع رکھا لیکن ان تمام پردوں کے پیچھے، مقصود اصلی سب کا کیا رہا؟ وہی دین کی خدمت، اُمّی کے لائے اور بتلائے ہوئے دین کی خدمت۔ کیا دنیا میں اُمیوں اور ان پڑھوں کو یہی مرتبے حاصل ہوا کرتے ہیں؟ اُمیوں کو چھوڑیئے، جو زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے گزرے ہیں، کیا ان میں سے کسی کو بھی ایسے شارح، ایسے ایسے خادم نصیب ہوئے ہیں؟ معانی و بیان اور بدیع پر لکھنے والوں کی تعداد، اس فہرست پر مستزاد۔

حکیم اور فلسفی

سب سے آخر میں فلسفیوں کو لیجئے۔ فلسفی بھی بھلا کسی کے ہوئے ہیں؟ لیکن یہاں یہ کیا ہے کہ ابن سینا و ابن رشد، طوسی و فارابی، رازی و شیرازی، سب کے سب اسی زلف کے اسیر، سب کے عقیدتوں کے دامن، اُمّی کے بندے سے وابستہ۔ کتنے علوم و فنون کے نام گنائے جائیں؟ زندگی کے کن کن شعبوں کو روشنی میں لایا جائے؟ قوت اور صولت کے کن کن پہلوؤں کو شمار کیا جائے؟ سرداروں اور ناموروں کے نام، شہادت میں کہاں تک پیش کئے جائیں کہ ؎

جملہ ترکانِ جہاں ہندوے تو

مدارس میں ذکر

مصر کے جامع ازہر اور آزاد اسلامی ممالک کے مدرسوں کو چھوڑیئے، غلام اور بے نوا ہندوستان[1] میں جہاں عربی کے سکّہ کا چلن کسی بازار میں بھی نہیں، یہ آخر ندوہ اور دیوبند کے سے عظیم الشان مدارس کس کا نام لئے ہوئے چل رہے ہیں؟ جامعہ ملیہ کس کی امت کی خدمت کی خاطر زندہ ہے؟

علی گڑھ، آزادیوں کے دعوے کے باوجود، کس کے دین و آئین کی پابندیوں پر نازاں ہے؟

[1] یہ تحریر بھی اس کتاب میں شامل دیگر تحریروں کی طرح آزادیٔ ہندوستان سے قبل کی ہے۔

کس وقت بلندی کا اعلان ہو رہا ہے

ھندوستان کے چھوٹے چھوٹے قریوں اور موضعوں، عرب کے ریگستان اور چٹیل میدان اور افریقہ کے صحرا و بیابان سے لے کر، لندن اور پیرس اور برلن کے تمدن زاروں تک، ہر روز، اور ہر روز میں بھی پانچ پانچ بار کس کے نام کی پکار، اللہ کے نام کے ساتھ ساتھ، بلند ہوتی رہتی ہے؟ —— اپنی ذاتی عقیدت مندی کو الگ رکھئے، محض ایک خالی الذھن اور ناطرف دار تماشائی کی حیثیت سے محض واقعات پر نظر کر کے فرمائیے، کہ یہ مرتبہ، یہ اکرام، دنیا کی تاریخ معلوم سے لے کر آج تک کسی ہادی، کسی رھبر، کسی مخلوق کو حاصل ہوا ہے؟ جس بے کس اور بے بس سے عین اس وقت جبکہ اسے زور اور قوت والے سردارانِ قریش اپنے خیال میں کچل کر اور پیس کر رکھ چکے تھے اور اس کا نام و نشان تک مٹا چکے تھے، یہ وعدہ ہوا تھا کہ

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

ہم نے تیرے لئے تیرا ذکر بلند کر رکھا ہے

اگر آوازہ اس کا بلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ نام اس کا سرفراز اور سربلند نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟

بلندئ ذکر کی یہ وہ تفسیر ہے جو اوراقِ لیل ونہار پر ساڑھے تیرہ سو برس سے ثبت چلی آرہی ہے۔ چشم روزگار اسے صدیوں سے پڑھتی چلی آرہی ہے، اور خدا جانے کب تک اسی طرح پڑھتی رہے گی۔

حشر کے دن عند اللہ، اس بندہ کا جو مرتبہ ہوگا، وہ تو ہو ہی گا، اس سے قطع نظر کر کے ذرا صرف اس مرتبہ کا تصور کیجئے، جو محض اس بلندئ ذکر کے لحاظ سے اس روز حاصل ہوگا۔ فوج کی فوج، انبوہ در انبوہ، ادھر سے ملوک و سلاطین چلے آرہے ہیں، ادھر سے بڑے بڑے نامور جنرل اور سپہ سالار —— ایک طرف سے محدثین کرام جوق در جوق چلے آرہے ہیں اور دوسری طرف سے مفسرین عظام، اہلِ فقہ، اہلِ اصول، اہل کلام، اہل تصوف، اہلِ لغت، اہل سیر، اہلِ رجال، اہلِ نحو، اہلِ معانی، اہلِ بیان، اہل فلسفہ، اہلِ منطق، اہلِ اخلاق، جس

فن کو بھی لیجئے "اس کے اندر ماہرین" ادب سے آنکھیں نیچی کئے، ہاتھ باندھے ہوئے خادمانہ انداز میں گرد و پیش حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ ایک اسی انعام کی پوری وسعت کا تصور کس کے بس کی بات ہے؟

سیرتِ نبویؐ

اور

علمائے فرنگ

نکتۂ شرع بہ افسانہ برابر بہ نہی
یورپ ار "گپ" زند آں نیز مسلّم باشد

— شبلیؒ

سیرتِ نبوی اور علمائے فرنگ

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں، جارج فنلے، برطانیہ میں ایک ممتاز مؤرخ گزرا ہے جرمنی کی گوٹنگن یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ایم۔اے اور ایل ایل ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ فنِ مخصوص تاریخ یونان تھا۔ یونان اور یونانیات کے محقق نے ۱۸۲۶ء سے لے کر ۱۸۶۴ء تک تاریخ یونان، سیاسیاتِ یونان وغیرہ پر انگریزی اور یونانی میں، تصانیف و رسائل کا انبار لگا دیا۔ ۱۸۴۴ء میں ایک کتاب "یونان، رومیوں کے عہدِ حکومت میں" — GREECE UNDER THE ROMANS — کے عنوان سے شائع کی، جو مدتوں اپنے موضوع پر مستند سمجھی گئی۔ ظہورِ اسلام تاریخ کے اسی عہد میں ہوا ہے۔ جس وقت رسول اللہ صلعم کی بعثت ہوتی ہے۔ روم کی حکومت یونان تک وسیع تھی، اور یونان اس کے ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ عہدِ صحابہ میں مسلمانوں اور رومیوں میں جو آویزشیں ہوئیں، یونان ہی کے واسطے سے ہوئیں۔ اس لئے اس تصنیف میں اسلام و شارح اسلام کا تذکرہ آجانا لازمی تھا۔

مصنف کو اسلام سے کوئی خاص عداوت یا تعصب نہیں اور نہ کتاب اسلام کے رد میں لکھی گئی ہے، لیکن بہرحال ہے ایک فرنگی کی تصنیف۔ صفحاتِ ذیل سے اندازہ ہوگا کہ جن علماءِ فرنگ کو کوئی خاص عناد، اسلام سے نہیں ہے، وہ بھی کس کس طرح واقعات کو مسخ کر کرکے پیش کرتے ہیں، اور خواہ ضمناً ہی سہی، سیرتِ نبوی کو کیسی کیسی تلبیسات و تحریفات کا ہدف بناتے رہتے ہیں۔

چند افراد کی ہدایت کیلئے بیتابی

عرب میں آفتاب رسالت کے طلوع ہونے سے قبل جو دھندلی روشنی کہیں کہیں ایک دو افراد کو

نظر آگئی تھی، اس کا نقشہ یہ مؤرخ اپنے قلم سے یوں کھینچتا ہے کہ گویا عرب میں خود ہی اصلاح کی تشنگی اور انقلاب کی تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اہلِ عرب چھٹی صدی عیسوی میں اپنے اخلاقی اور سیاسی تمدن میں تدریجاً ترقی ہی کرتے رہے۔ اور ان کے مذہبی خیالات میں بہت زائد تغیرات ہو گئے تھے۔ ان کی تجارت کی، جو خود انہی کے ہاتھ میں تھی، اہمیت، مضبوط ہمسایوں کے کمزور پڑ جانے سے بڑھ گئی تھی، اور اس کی ترقی سے وہ خود اپنی نظر میں بہت اہم ہو گئے تھے اور اتحادِ قومی کے وہ خیالات ان میں موجزن رہنے لگے تھے جو اس سے قبل نہیں ہوئے تھے۔ ہرقل کی تخت نشینی سے قبل والی صدی میں، یہ اسباب ساری عرب آبادی پر زبردست اثر ڈال چکے تھے، اور یہ نہ نظر انداز ہونا چاہئے کہ محمدؐ کی ولادت جسٹینین دوم کے زمانہ میں اور تربیت اسی قومی جوش کے درمیان ہوئی۔

باب ۴، فصل ۵، صفحہ ۳۲۲ مطبوعہ
ڈنٹ اینڈ سنز، لندن۔

انتشارِ حواس کا اس سے بہتر نمونہ ملنا دشوار ہے۔ مصنف کے سامنے شارع اسلام کی معجزانہ کامیابی بطور واقعہ موجود ہے، اور وہ بے چارہ مبہوت ہے کہ اس کی اہمیت کو کیونکر گھٹائے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بعثتِ رسولؐ کو مذہبی جامہ میں پیش کرے یا محض سیاسی رنگ میں، خلط مبحث کر کے وہ مجبوراً ایسے الفاظ لکھ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا حضورؐ کا اصلی مشن سیاسی تھا، یعنی قبائلِ عرب کو متحد کرنا اور ملک میں ایک قومی اتحاد قائم کرنا۔ اگر یہی مراد ہے تو اس سخن فہمی کے قربان جائیے۔

توحید پر اس قدر زور دینے کی ضرورت

مقصد اگر سیاسی تھا تو توحید خالص پر اس قدر زور دینے، بت پرستی کے مٹانے، اس کی خاطر جہاد و قتال کرنے، ایک مخصوص نظامِ عقائد اور متعین ضابطۂ عبادات پیش کرنے کی خدا معلوم کیا

ضرورت تھی اور پھر فیلے صاحب تو چشم بددور مؤرخ ہیں۔ اگر اتحاد سیاسی و قومی کی تحریک عرب میں، ظہور اسلام سے قبل پھیلنی شروع ہو گئی تھی، تو کاش اس تحریک کے دو ہی چار علمبرداروں کے نام گنا دیئے ہوتے۔

پھر اگر مؤرخ موصوف کی یہ مراد ہے کہ تحریک تھی تو مذہبی ہی اصلاح کی، لیکن اس حیثیت سے بھی تحریک کی بنیاد قبل سے ہو چکی تھی، تو کاش ایسے ہی مصلحین دین کے کارناموں کی ذرا تصریح کر دی گئی ہوتی، جس سے معلوم ہو جاتا کہ فلاں فلاں حد تک کام قبل سے ہو چکا تھا، اور اس کے بعد اسلام نے اضافہ کیا۔ ابن ہشام وغیرہ میں لے دے کے، چار ایسے شخصوں کے نام لئے ہیں، جو شرک و بت پرستی کے آبائی مذہب سے بیزار ہو کر، دین ابراہیمی کی تلاش میں دربدر ملک ملک پھرنے کو نکلے تھے۔ ان میں سے دو بالآخر عیسائی ہو گئے۔ ایک آخر تک بھٹکتا اور رنگ بدلتا رہا۔ اور صرف چوتھے کی قسمت میں مسلک توحید پر قائم رہنا آیا۔

کیا اسی کا نام، زمین کی تیاری ہے؟

ایسے اِکّے گِنے، چند افراد، کس قوم میں، اور کس زمانہ میں ہدایت یافتہ نہیں نکلتے رہے؟

دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ آیا ان چند افراد کا، یا مسیحیت کا، یا یہودیت کا، یا کسی مذہب کا کوئی اصلاحی اثر عرب نے قبول کیا تھا؟ —— اس کا جواب نفی میں، صرف مسلمان مؤرخ ہی نہیں، بلکہ میور صاحب بھی دے چکے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"محمدؐ کی زندگی کے زمانہ میں عرب کی حالت نہایت جمود کی تھی۔ اصلاح کی طرف سے اتنی مایوس کن حالت شاید پیشتر کبھی بھی نہ رہی ہو۔ بعض اوقات ایک واقعہ کے ہو چکنے کے بعد اس کے عجیب عجیب اسباب گڑھ لئے جاتے ہیں۔

محمدؐ کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی سارے عرب میں ایک نئی اور ایمانی روح دوڑ گئی۔ اس سے نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ عرب اس وقت تبدیلی کیلئے جوش میں تھا، اور اس کے قبول کرنے کو بالکل آمادہ تھا۔ یہ قیاس، تاریخ

قبل اسلام کے واقعات کے بالکل منافی ہے"

مقدمۂ سیرۃ محمدی، باب ۲، ص ۹۶، ۹۷

مطبوعہ، جان گرانٹ، ایڈیٹر۔

بے سروسامان اسلامی لشکر اور روم کی شکست

اسلامی لشکر کے ہاتھ سے ہرقل، رومی شہنشاہ کی شکست، تاریخ کا ایک عجیب ترین واقعہ ہے۔ ایک طرف ہر طرح کا ساز و سامان، پشتہا پشت کا جنگی تجربہ، دولت و علم کثرتِ افواج اور اسلحہ، اور دوسری طرف تعداد بھی قلیل اور سامانِ جنگ بھی کچھ یوں ہی سا۔ علوم و فنون سے بیگانگی اور ساز و سامان کی ناداری، کامیابی اور نمایاں کامیابی، اس آخری فریق کو نصیب ہوتی ہے، اس واقعہ کی تصویر اس مرقع میں یوں نظر آتی ہے۔

"جہاں ایک طرف ہرقل کی کوشش یہ رہی کہ شرقی سلطنت کی کھوئی ہوئی عظمت واپس آجائے، اور اس اتحاد مذہبی کے نفاذ کی دھن سوار رہی، جو ذہن بشری کے لئے ہمیشہ ایک عظیم ترین مغالطہ رہا ہے، وہاں دوسری طرف محمدؐ نے نوع انسان کے جذبۂ توحید کا صحیح تر اندازہ کر کے ملک عرب کو ایک حکومت قرار دے دینے اور سب سے ایک مذہب اختیار کرا لینے میں کامیابی حاصل کر لی"

ص ۲۴۱-۲۴۲

سبحان اللہ وبحمدہٖ۔ ہرقل ایک عظیم الشان سلطنت کا تاجدار ہے۔ حکومت مدتوں سے اس کے خاندان میں چلی آرہی ہے، زر و جواہر کا خزانہ رکھتا ہے، اہلِ علم و اہلِ خرد ارد گرد موجود ہیں، اس کی ساری مساعیٔ اتحاد ناکام رہیں، اور اس ناکامی کی بنا پر نفس؟ یہ کوشش ہی "ذہن بشری کا ایک عظیم ترین مغالطہ" قرار پا جائے، لیکن جب بادیۂ عرب کا ایک اُمّی، تہذیب و شائستگی کی اقلیموں سے دور، تہی دست و فاقہ کش، چند سال کے اندر، دیکھتے دیکھتے، ملک کے ملک کی کایا پلٹ کر دے، اور سب کے دلوں کے عقائد ہی نہیں، زندگیوں کے اعمال بھی بدل دے۔

تو اس کے عقب میں نہ کسی نصرتِ غیبی کا اعتراف کیا جائے نہ کسی ملکوتی قوت کی امداد تسلیم کی جائے، بلکہ محض یہ کہہ کر دل کو سمجھا لیا جائے کہ آپ کو فطرتِ بشری کا صحیح تر اندازہ تھا۔ یہ مؤرخانہ واقعہ نگاری ہے۔ اس کا نام محققانہ روشن خیالی ہے۔

کمالِ تلبیس

یورپ کو اسلام و شارعِ اسلامؐ کے معاملہ میں جو کمالِ تلبیس حاصل ہے، اس کا دلچسپ نمونہ یہی اقتباسات بالا ہیں۔ لکھنے والا کوئی پادری نہیں، مسیحی مناظر نہیں، ایک مؤرخ ہے، صاحبِ علم اہلِ قلم ہے۔ موضوعِ تصنیف تردید عقائد اسلامی نہیں، تاریخِ یونان ہے۔ اسلام و شارعِ اسلام کا تذکرہ محض ضمناً آ جاتا ہے، پڑھنے والا بیچارہ بالکل خالی الذہن ہو کر پڑھ رہا ہے، پڑھتے پڑھتے یک بیک رسولِ اسلامؐ کا نام آتا ہے، کسی ظاہری، بیہودہ تنقیص اور لفظی توہین کے ساتھ نہیں، بلکہ اعترافِ عظمت کے ساتھ، لیکن حیثیت جو ظاہر کی جاتی ہے، وہ نبیؐ برحق کی نہیں، صاحبِ وحی کی نہیں، کسی مقدس و برگزیدہ ولی کی بھی نہیں، بلکہ محض ایک تدبیر و کامیاب لیڈر کی، اور پیغمبرانہ کارناموں کی داد یہ کہہ کر ختم کر دی جاتی ہے کہ آپؐ نے فطرتِ بشری کا خوب اندازہ کر لیا تھا — اب سادہ دل مسلمان طالبِ علم، جو مصنف کی بے تعصبی، رواداری اور قوتِ تحقیق کا کلمہ پہلے سے پڑھ رہا ہے، جب اچانک ایسے موقع پر پہنچتا ہے تو عموماً خلوئے ذہن کے ساتھ وہ اس باب میں بھی مصنف کے بیان سے اسی طرح متاثر ہو جاتا ہے، جس طرح مصنف اس پر اثر ڈالنا چاہتا ہے، اور بے اختیار وہ نبیؐ کو محض ایک کامیاب قائد، ایک اولوالعزم فاتح، ایک نامور مدبر کی حیثیت میں دیکھنے، سمجھنے اور ماننے پر قانع ہو جاتا ہے (مسیحی مشنری اور پادری کے حملے، کم از کم سامنے کے تو ہوتے ہیں۔ "فرنگی محقق" کے وار ہمیشہ یونہی پشت کی طرف سے، بے خبری کے عالم میں، اچانک ہوتے رہتے ہیں)۔

غزوات کی فتحمندیاں، مستقل معجزات

غزوات میں فتحمندیاں، حضورؐ کا ایک مستقل معجزہ ہیں، اور منکروں پر ایک مخصوص حجت

کافروں کی طرف سے بار بار مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی فرقان مبین کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ یہ فرقان مادی آنکھوں سے نظر آجانے کے قابل، معجزانہ فتحمندیوں کی شکل میں ظاہر ہو کر رہا۔ ان آنکھوں کی خیرہ کردینے والی کامیابیوں اور کامرانیوں سے انکار کسی بڑے سے بڑے منکر کے لئے بھی ممکن نہیں۔ البتہ آج کا پڑھا لکھا منکر کرتا یہ ہے کہ واقعات کو مان کر ان کی توجیہ و تاویل کے لئے بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے۔ پرانے ملحد معجزات کی تاویل "سحر" سے کیا کرتے تھے، جدید منکرین کو روشن خیالی کی چند اصطلاحیں ہاتھ آگئی ہیں، وہ ان سے اپنے دل کو تسکین دے لیا کرتے ہیں، فتوحات اسلامی کی تمہید میں ڈاکٹر فنلے فرماتے ہیں:

"خسرو و ہرقل کے ماتحت ایران و روم کی سلطنتوں میں جو حیرت انگیز انقلابات ہوتے، وہ سب کے سب اس عظیم الشان اثر کے آگے ماند ہو جاتے ہیں جو ان کے معاصر، محمدؐ، پیغمبر عرب نے ان ممالک کی سیاسی، معاشری اور مذھبی زندگیوں پر ڈالنا شروع کر دیا، جن پر تسلط جمانے کی ان سلاطین کو اس قدر آرزو رہا کرتی تھی"۔

باب ۵، فصل ۲، ص ۲۵۲

گویا حضورؐ کی معجزانہ طاقت کا اعتراف ہے، اس کا اقرار ہے کہ جو انقلاب اس ذات مبارک نے دیکھتے دیکھتے پیدا کر دیا، اس کی نظیر پیش کرنے سے روم و ایران کی پُرقوت سلطنتیں مع اپنے تمام وسائل و خزائن کے عاجز ہیں، لیکن — اور یہیں سے گمراہی کی بنیاد پڑتی ہے — اس کی وجہ یہ نہیں کہ نبی اپنے دعویٰ نبوت میں سچا تھا، بلکہ صرف یہ کہ وہ بڑا عقلمند اور بڑا نکتہ رس تھا۔ فرماتے ہیں:

"محمدؐ کی کامیابی بہ حیثیت شارع کے، ایشیا کی قدیم ترین اقوام میں، اور ان کے قائم کئے ہوئے اداروں کی پائداری نسلہا نسل تک اور ہر طبقۂ معاشرت میں ثابت کرتی ہے کہ یہ غیر معمولی انسان، ملائی کرگس اور سکندر دونوں کا ایک نادر مجموعہ تھا"

جامعیت کا کمال

دوسرے لفظوں میں، یہ تسلیم ہے کہ حضورؐ کی شخصیت عام انسانوں سے مافوق تھی، یہ بھی تسلیم ہے کہ حضورؐ کے اصلاحی کارنامے حیرت انگیز ہیں، لیکن یہ ماننے کا گویا امکان ہی نہیں کہ ایسا شخص اپنے دعووں میں سچا تھا، بلکہ ان معجزانہ کامیابیوں کا راز صرف یہ تھا کہ آپؐ کی ذات میں بڑے سے بڑے فاتح اور بڑے سے بڑے مدبر و مقنن کے "اوصاف نادرہ" جمع ہوگئے تھے ــــ روایات میں آتا ہے کہ ابوجہل، جب معجزات و مادی آیات سے عاجز و لاجواب ہوجاتا تھا، تو آخر میں یہی کہہ کر اپنی کھسیاہٹ مٹا لیا کرتا تھا کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص بڑے غضب کا ساحر ہے ــــ آج کے روشن خیال کا انکار نبوت، کیا ابوجہل کی ذہنیت سے کچھ بہت مختلف ہے؟

اُسکی نظیر کہاں ہے؟

دنیا میں کس سکندر، کس نپولین، کس چنگیز نے اتنی بے سروسامانی کے ساتھ ایسے عظیم الشان فتوحات حاصل کئے ہیں؟ کس فوجی جنرل کی سپاہ نے اپنے اخلاقِ حسنہ کا اتنا زبردست نمونہ پیش کیا ہے؟ کس فاتح کشور کشا لشکر کے پیادے ایسے حق پرست، ایسے متدین، ایسے نیک سرشت گزرے ہیں؟ کس فوج کے سپاہیوں نے دن بھر روزے رکھ رکھ کر، اور راتوں کو تہجد میں گزار گزار کر، محض جنت کی خاطر، اللہ کے ہاں پروانۂ مغفرت حاصل کرنے کیلئے اپنے سے کئی کئی گنے لشکروں کا مقابلہ کیا ہے؟ کس مقنن نے فطرت بشری کو اس درجہ ملحوظ رکھ کر، دنیا کے ہر گوشہ کے لئے، بنی آدمؑ کی ہر نسل کے لئے، معاشرت و تمدن کے ہر طبقہ کیلئے، عالمگیر قوانین وضع کئے ہیں؟ کس قانون ساز نے، حق و انصاف، امانت و دیانت، عفت و شرافت، اصلاح نفس و تزکیۂ باطن کو تمام وقتی مصالح و ہنگامی خواہشوں پر مقدم رکھا ہے؟ وہ پاک و پاکیزہ ملکوتی شخصیت، جو ایسی پاک و پاکیزہ ملکوتی تعلیم کی سرچشمہ ہو، اسے دنیا کے ملک گیر فاتحوں اور قانون سازوں کی قطار میں شمار کرتے، مصنف کو کچھ بھی غیرت نہ آئی؟ اگر یہی نمونۂ علم و تحقیق ہے تو خدا معلوم جہل کسے قرار دیا جائے گا؟

آگے چل کر حضورؐ کی شخصیت اور کارناموں کا پر اعتراف ہے، لیکن جیسے لکھتے لکھتے کوئی چونک پڑتا ہے کہ کہیں اس سے تصدیقِ نبوت نہ ہونے لگے، یہ بھی ارشاد ہو جاتا ہے:

"محمدؐ کی پیدائش ایسے وقت میں ہوئی، جب دنیائے متمدن کے طبقۂ حکمران وطبقۂ امراء میں نمایاں عقلی انحطاط تھا۔ اس وقت عموماً دنیا جس سطحِ معاشرت پر تھی، اس سے بہتر کی طلب پیدا ہو چکی تھی، اور حالاتِ عصریہ سے بے اطمینانی تقریباً ہر ملک میں پھیل چکی تھی۔ عرب میں مذہب شرک و بت پرستی سے بہتر کسی مذہب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اور ایران، شام ومصر کے لوگ بھی مجوسیہ، یہود اور مسیحیوں کے نزاعات سے تنگ آ کر ایک بہتر دین کی جستجو میں تھے۔"

ملخصاً، ص ۲۵۲

کیا طلب کا یہی ثبوت ہے

گویا "بہتر دین" کی طلب وتلاش تو سب کو تھی، لیکن جب وہ "بہتر دین" پیش کیا گیا تو سارا عرب، مقابلہ ومقاتلہ کو تیار ہو گیا، اور ملک کا بچہ بچہ تک، اس بہتر دین کے لانے والے کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

کیا طلب وتلاش کا یہی ثبوت تھا؟

کیا یہ طلب وتلاش، اسی سے ثابت ہوتی ہے کہ سالہا سال تک اس دین کے لانے والے کے خلاف، سخت سے سخت خونریز لڑائیاں جاری رہیں اور مقاطعہ کر کر کے اس دینِ برحق کے داعی پر، زندگی تنگ کر دی گئی؟

عرب ومضافاتِ عرب اگر ایسے ہی، ایک نئے دین کے لئے بے قرار تھے تو کیوں نہ اس پیمبر کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور سب کے سب نہ سہی، تو آخر کیوں نہ ایک بڑی جماعت معاً اس دعوت پر لبیک کہنے کو اٹھ کھڑی ہوئی؟

اس سے بھی قطع نظر کر کے اگر نفسِ دعوتِ جدیدہی کامیابی کی ضامن ہو سکتی تھی، تو عین اس

اس زمانہ میں مسیلمہ اور اسود عنسی بھی تو وحی و نبوت ہی کے دعوے لے کر اٹھے۔ پھر آخر کیوں نہ کامیاب ہوئے؟ انھیں کیوں نہ سرسبزی نصیب ہوئی؟

ڈاکٹر فنلے صاحب اس کھلے ہوئے اعتراض سے غافل نہیں ہو سکتے تھے، ضمیر نے خود خلش محسوس کی، لیکن جو جواب سوچا، وہ اس قابل ہے کہ یا تو اس پر خوب ہنسا جائے، اور یا محض رو دیا جائے۔ کہتے ہیں:

"عرب کے ذہن عامہ کے جس جوش نے محمدؐ کو پیدا کیا، اسی نے بہت سے اور پیمبر بھی انھی کے زمانہ میں اٹھا کھڑے کیے۔ لیکن محمدؐ کی اعلیٰ قابلیت اور انصاف کے صحیح تر اندازہ، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سچائی نے ان لوگوں کے سارے منصوبوں کو برباد کر دیا"

ص ۲۵۲

گویا، اور ہر شے کا اعتراف ہو گا، رسولؐ کی قابلیت، فہم و ذکا، نکتہ رسی و دُور اندیشی، ذاتی صداقت و امانت، سب کا اقرار ہو گا، لیکن جس شے کے تسلیم کرنے سے درجۂ احتمال میں بھی گریز ہو گا، وہ صرف یہ ہے کہ یہ سچا اور قابل شخص اپنے دعویٰ نبوت میں بھی سچا تھا... اور ہر کوشش اسی کی جاری رہے گی، کہ پڑھنے والا کسی ہیر پھیر سے گھوم گھما کر بھی، اس عقیدہ کے قریب نہ آنے پائے۔

کارلائل کی سیرت نگاری

ٹامس کارلائل، مؤرخ نہ تھے، ادیب تھے۔ ان کا شمار انیسویں صدی کے مشہور ترین اہل قلم اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں اپنی کتاب ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ (بطل اور بطل پرستی) شائع کی۔ مختلف ابواب میں مختلف مشاہیر تاریخ کو لے کر انھیں کسی نہ کسی حیثیت سے بطل (ہیرو) قرار دیا ہے، مثلاً شاعروں میں شیکسپیر اور دانتے، فرمانرواؤں میں کرامول اور نپولین وقس علیٰ ہذا، اور ان سب کی زندگیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک باب حضورؐ سے متعلق بھی ہے۔ حضورؐ کو پیمبروں میں ہیرو مانا ہے اور اسی حیثیت سے حضورؐ

کی زندگی اور اسلام پر تبصرہ ہے۔

نیکی، انصاف پسندی کی نوعیت اور حد

پادریوں نے تو حضورؐ کی ذات مبارک سے ایسی کھلی ہوئی گندہ دھنی کی ہے کہ خود یورپ میں بھی اب ان کی تحریروں کا کوئی اثر باقی نہیں رہا ہے کم ازکم کوئی مسلمان تو شاید ہی ان کی کسی تحریر سے متاثر ہو سکے۔ اس طبقہ سے قطع نظر کرکے، عام مصنفین و ارباب قلم کا جو گروہ ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو حضورؐ کو کھلے الفاظ میں (نعوذ باللہ) "پیمبر خادع" کہتے ہیں۔ اور سیرت مبارک پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں، دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے آپ کو انصاف، رواداری اور بے تعصبی کا مجسمہ ظاہر کرتے ہیں، اور گویا پہلے گروہ کے جواب میں، سیرت انور کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔۔۔ کارلائل کا شمار اسی آخری گروہ میں ہے۔ اس گروہ کا انداز بیان یہ ہوتا ہے کہ:

> "لوگوں نے تاریخ کی اتنی ممتاز شخصیت کو طرح طرح بدنام کر رکھا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اس بدنامی کو دور ہونا چاہیئے۔ ہمیں خود اپنی ناانصافیوں کی تلافی کرنی چاہیئے۔ محمدؐ، عرب کے مصلح، مشرق کے ایک بطلِ اعظم، ہرگز ان الزامات کے مورد نہیں، جو ان پر لگائے گئے ہیں۔ وہ نہ چور تھے نہ ڈاکو نہ دھوکے باز، نہ نفس پرست۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے اور کامیاب مصلح تھے۔ ملک عرب کی انھوں نے کایا پلٹ دی۔ وہ بڑے مخلص و نیک نیت تھے۔ انھوں نے وحشیوں کو انسانیت سکھا دی۔ کروڑوں آدمی ان کے تقدس کے قائل ہیں، ہمیں بھی ان کا نام عزت اور تکریم سے لینا چاہیئے۔"

غریب اور بے خبر، کتاب کا پڑھنے والا نوجوان اور کمزور عقیدہ کا مسلمان، سب سے زیادہ اسی فریب کاری، اسی اندازِ دجل کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ مصنف کی نیک نیتی، انصاف پسندی پر اعتماد کرکے، اپنی رائے اُسی کے بیان کے مطابق ڈھالنا شروع کرتا ہے، اور جب کتاب ختم کرتا ہے تو اکثر صورتوں میں اس کے ذہن کے سامنے، حضورِ انور کی تصویر، بجائے اللہ

کے ایک سچے اور برگزیدہ نبی کے، بجائے تمام عالم کے لیے مشعلِ راہ ہونے کے، محض ایک مخلص اور نیک سیرت مصلحِ وقت کی رہ جاتی ہے۔ کارلائل کا مقالہ انہی خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔ راقم مضمون کے اوپر، کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں خود یہ کیفیت گزر چکی ہے۔ حضورِ انور کی ذاتِ مبارک سے اُسے جو بدعقیدگی پیدا ہوئی، وہ کسی کھلے ہوئے دشمنِ اسلام کی تحریر کے اثر سے نہیں، بلکہ اسی قسم کے دوست نما فرنگی دشمنوں کی تحریروں سے۔ پیمبر کو اس رنگ میں دیکھنا، ایسی ہی بات ہے، جیسے صوبہ کے گورنر سے کہا جائے کہ حضور والا کے اختیارات کا کیا کہنا، آپ پٹواریوں سے بڑھ کر اختیارات رکھتے ہیں اور چپراسیوں سے بڑے حاکم ہیں۔ یہ گورنر کی مدح ہوئی یا اس کے ساتھ تمسخر؟

مقالہ کے خاتمے پر کارلائل صاحب جوش و خروش سے لکھتے ہیں:

"یہ محمد کا مذہب، عرب قوم کے حق میں گویا تاریکی سے روشنی کی طرف آنا تھا۔ عرب پہلے پہل اسی مذہب سے زندہ ہوا۔ گلہ چرانے والی ایک غریب قوم، جو آفرینشِ عالم سے اب تک، دنیا کی نظروں سے مخفی، جنگلوں میں پھر رہی تھی، ایک پیمبرِ اعظم ان کی طرف بھیجا گیا، ایسے پیام کے ساتھ جس پر وہ ایمان لاسکتے تھے، اور دیکھو، جو قوم گمنام تھی، وہ مشہورِ آفاق ہوگئی، جو حقیر تھے، وہ دنیا بھر میں مغرور ہوگئے۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ تک پھیل گیا اور دوسری طرف دہلی تک۔"

صرف کامیابیوں پر نظر ہے

عرب کے اہلِ جاہلیت قائل صرف مادی معجزات کے تھے۔ بار بار مطالبہ حسی معجزات کا کرتے تھے۔ ٹھیک یہی ذہنیت فرنگستان کی ہے۔ اس کے بھی بڑے سے بڑے عقلاء و علماء کے ذہن کی رسائی بس یہیں تک ہے کہ ایک اُمّی نے سارے ملک کو متحد کر دیا، اور اس کے ہاتھوں دنیا کی بڑی بڑی قوموں کو شکست دلا دی، اور جس کے ہاتھوں یہ حسی و مادی معجزات ظہور پذیر ہوئے۔ اگر اُسے بہت بڑا مصلح، بہت بڑا مدبر تسلیم نہ کیا جاتے تو اور کیا کیا جائے گا۔ کارلائل کے اقتباس

بالا کا ماحصل یہی ہے کہ حضورؐ نے عرب میں ایک نہایت زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ بے خبر اور بھولا کارلائل کے نام سے مرعوب، مسلمان نوجوان جب یہ پیراگراف پڑھتا ہے، تو ایک طرف کارلائل کے وسیع الخیالی اور منصف مزاجی کی داد دے اٹھتا ہے، لیکن ساتھ ہی دوسری طرف حضورؐ کی عظمت کی بھی کل اتنی ہی کائنات سمجھنے لگتا ہے کہ آپ نے قوم عرب کو مادی پستیوں سے نکال کر دنیوی عروج و ترقی کے مرتبۂ کمال پر پہنچا دیا۔ اسلام "محمدؐ کا مذہب" مقالہ میں شروع سے آخر تک ہے۔ گویا اس کو وحی ربانی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا، حضورؐ کا سوچا اور قائم کیا ہوا ایک نظام تھا

اخلاصِ رسولؐ کا ذکر، چند نمونے

حضورؐ کی حمایت میں جو کچھ کہا ہے، اس کے چند نمونے ملخصاً ملاحظہ ہوں:

"کسی بڑی شخصیت سے متعلق میں کبھی یقین ہی نہ کر دوں گا کہ وہ سچا نہیں تھا۔ صداقت تو اس کے وجود کی بنیاد ہی ہوتی ہے۔ میرابو، نپولین، برنس، کرامول (مدبرین اور فاتحوں کے نام ہیں) غرض جس کسی نے بھی کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، سب کے سب مخلص ہوتے ہیں۔ اخلاص، عمیق، عظیم، حقیقی اخلاص، تمام بڑے آدمیوں کے وجود کی پہلی شرط ہے۔"

رسولؐ کی سچائی کی حقیقت آپ نے دیکھ لی؟ یہ نہیں کہ اپنے دعوائے نبوت میں سچے تھے بلکہ جس طرح نپولین، کرامول وغیرہ، مکروزور، تکلف و تصنع سے الگ ہو کر، دل لگا کر، اخلاص کے ساتھ، اپنے کام پر اعتقاد رکھتے تھے، حضورؐ کی بھی نیت کسی مکروفریب کی نہ تھی۔ آپ سادگی کیساتھ وہی کہتے تھے، جو واقعۃً آپ محسوس کرتے تھے، جو واقعۃً آپ کے دل میں ہوتا تھا۔ آپ کی زبان آپ کے دل سے مختلف نہ تھی۔

"غرض، اس محمدؐ کو ہم کسی طرح بے مایہ، یا سازباز کرنے والا تسلیم نہیں کر سکتے۔ تصنع تو اس کو چھو نہیں گیا تھا۔ دیدہ و دانستہ کوئی سکیم تیار کرنا اس کے دائرہ عمل سے باہر تھا۔ اپنا تیز و تند پیام جو انھوں نے پہنچایا، وہ وہی تھا، جو حقیقتہً انھیں محسوس ہوتا تھا، جو واقعتہً ان کے عمق قلب سے نکلا تھا۔ جو خامیاں، نقائص، عیوب انکی جانب

منسوب کئے گئے ہیں، اگر وہ ثابت بھی ہو جائیں، جب بھی ان کی اخلاص مندی مسلّم رہتی ہے۔"

کارلائل کے اقتباسات، اردو میں بارہا بطور ایک حامیٔ اسلام کے پیش کئے گئے ہیں۔ یہانتک کہ ایک شیعی کرم فرمانے کارلائل کے اس مقالہ کا پورا ترجمہ بھی اپنے نزدیک خدمتِ اسلام سمجھ کر شائع کر دیا ہے۔ اب تو آپ پر کارلائل کی اسلام دوستی کی حقیقت واضح ہو گئی ہی؟

یہ پھر غنیمت تھا۔ جو کچھ اس نے زہر اگلا ہے، اس کے اصلی نمونے اب آنے کو ہیں۔ یہ مقصود نہیں کہ اس کی نیت بھی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی تھی۔ اسے تو اس کا خیال بھی نہ ہوگا کہ اس کی کتاب ترجمہ ہو کر کبھی مسلمانوں کی نظر سے گزرے گی۔ سوال اس کی نیت کا نہیں، اس کی تحریروں کے اثر کا ہے۔ نیت اس کی کچھ بھی ہو، حضورؐ کی ذات سے رفع ملامت ہی اس کی نیت سہی، بہرحال وہ بہرصورت اثر اس کی تحریروں کے مطالعے کا پڑتا ہے کہ عظمتِ نبوت دل سے مٹتی جاتی ہے، اور انسان اقرارِ رسالت سے دور ہی پڑتا جاتا ہے۔ آج ہندوستان میں جو صدہا ہزار نوجوان مسلمان، لامذہب ہو گئے ہیں، ان کی ابتدائی بنیاد اسی قبیل کے مصنفین کی تحریروں سے پڑی ہے۔

قرآن پاک کے باب میں جہل

اپنی اسلام دوستی کا اعتماد دلوں میں پیدا کر کے اور اپنی اسلام نوازیوں کے مظاہرہ کے بعد یہ بزرگوار سرچشمۂ نور و ہدایت، قرآن پاک سے متعلق یوں گہر افشانی فرماتے ہیں۔

> "متفرق اور منتشر جملے، ایک دوسرے سے غث پٹ، ایک ہی بات کی بار بار تکرار۔ پیچ در پیچ، الجھی ہوئی تقریر، مجمل اور مبہم، غرض بالکل مہمل۔ کوئی یورپین، سوا اس صورت کے کہ اسے فرض ادا کرنا ہو، سارے قرآن کو پڑھنے کا تحمل ہی نہیں کر سکتا۔"

ماشاء اللہ۔ یہ ہے فرنگی داناؤں کے ایک دانا کی رائے، آپ کی اس کتاب سے متعلق، جس کا ہمسر و نظیر معنوی و لفظی، ادبی و اخلاقی، ہر حیثیت سے، آج تک نہ دنیا کا کوئی صحیفہ ہو سکا نہ آئندہ ہوگا۔ اور ظالم نے یہ رائے قائم کیونکر کی؟ قرآن کو پڑھ کر نہیں، قرآن کے انگریزی ترجمہ کو پڑھ کر،

جو کسی مسلمان کا نہیں، ایک پادری کا کیا ہوا تھا۔ اور پھر ترجمہ بھی براہ راست عربی سے نہیں، بلکہ لیٹن ترجمہ کا انگریزی ترجمہ۔ اور خدا معلوم، لیٹن کا ترجمہ بھی براہ راست تھا، یا وہ بھی بالواسطہ تھا۔ یہ ہے دانایانِ فرنگ کی دانائی اور احساس ذمہ داری کہ واسطہ در واسطہ کا ترجمہ، اور وہ بھی دشمن کے قلم سے، دیکھ کر اس جزم و تیقن کے ساتھ رائے قائم کر لیتے ہیں، اور اُسے اس دریدہ دہنی کے ساتھ بک ڈالتے ہیں ـــــ چاہئے یہ تھا کہ اس مضحک و مجنونانہ رائے کے علم ہو جانے کے بعد خود کارلائل کے عقل و فہم، مذاقِ سلیم اور توازنِ دماغی پر فاتحہ پڑھ دیا جاتا، لیکن مرعوب اور غلامانہ ذہنیت کا نوجوان مسلمان، ان چیزوں کو پڑھ کر خود یہ سوچنے لگتا ہے کہ جب ایسے بڑے شخص، اور اتنے بڑے محققِ خیالی دماغ نے یہ رائے ظاہر کی ہے تو کچھ نہ کچھ اصلیت تو اس کی ضرور ہو گی ـــــ اور یہی وہ فتنہ ہے جو ساری انگریزی تعلیم، انگریزی تمدن، انگریزی حکومت کے عقب میں مخفی ہے۔

"تاریکی کو اُجالے سے بدلنے کے لئے جتنی روشنی مل سکتی تھی، بادیہ عرب کی اس روح مضطر کو مل گئی تھی۔ اس تاریکی میں، جو موت کے حکم میں داخل تھی، وہ روشنی داخل ہوئی، جو گو منتشر تھی، لیکن اس میں زندگی کی، اور آسمانی جگمگاہٹ اور خیرگی شامل تھی۔ محمدؐ نے اسے وحی قرار دیا، اور فرشتہ کا نام جبرئیل رکھا۔ ہم آج بھی اس کا صحیح نام اور کیا رکھیں؟"

گویا ایک مصلح کے قلب پر ایک نورانی کیفیت طاری ہوئی، اس کا نام اس مصلح نے اپنی سمجھ کے موافق "وحی" رکھ دیا، اور وحی لانے والے کا نام جبرئیل گڑھ دیا، کھلے لفظوں میں حضورؐ پر کذب و بددیانتی کا الزام کہیں نہیں، ہر جگہ خلوص و حسن نیت کا اعتراف لیکن اندر ہی اندر زہر پھیلتا چلا جا رہا ہے اور حضورؐ کے دعویٰ کی تردید قدم قدم پر جاری ہے۔

قرآن پاک سے متعلق جو مزید گستاخیاں اور گندہ دہنیاں ہیں، ان کے نقل کرنے کی نہ چنداں حاجت ہے، اور نہ آگے ہمت ہی پڑتی ہے۔ نمونہ دکھا دینے کے لئے جو کچھ گزر چکا، بالکل کافی ہے۔ ہمارے نوجوان جب کارلائل کے قلم سے یہ دادِ تحقیق دیکھتے ہیں تو چونکہ قلب کارلائل کی عظمت کو ایک مسلم و غیر مشتبہ حقیقت سمجھ رہا ہے، اس کے نام سے مرعوب ہے، اُدھر ذہن جاتا ہی

نہیں کہ خود کارلائل نے سخت ٹھوکر کھائی ہے' بلکہ دماغ میں سلسلۂ خیالات یوں قائم ہوتا ہے کہ :

"جب ایسے ایسے محقق' آزاد خیال و منصف مزاج حکماء قرآن سے متعلق' باوجود تائید و ہمدردی' ایسے ایسے خیالات کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں' تو ہو نہ ہو' ضرور کہیں پانی مرتا ہے۔ اب تک ہم نے خاندان میں' اور گردوپیش جو روایتیں سنی تھیں' وہی معلوم ہوتا ہے کہ غلط ہیں۔ آخر کچھ تو ایسی شدید و واضح کمزوریاں قرآن میں ہیں کہ' ایسا عالی دماغ شخص بھی ان کی تاویل نہ کر سکا' اور اسے اعتراف حقیقت پر مجبور ہونا پڑا۔

زیادہ خطرناک کون ہیں؟

یہیں سے یہ ہے کہ کارلائل' گبن وغیرہ کے طرز کے مغربی مصنفین' کھلے ہوئے گندہ ذہن راجپال وغیرہ سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں۔ راجپال وغیرہ کی بیہودگی دیکھ کر ایک برائے نام مسلمان کی بھی غیرت و حمیت ضرور ابھر آتی ہے' اور وہ جواب و دفاع پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ کارلائل وغیرہ کو دوست سمجھ کر مطالعہ کرتا ہے' اور طبیعت کسی دفاع و مقابلہ کے لئے آمادہ نہیں ہوتی' کہ یک بیک اور اچانک' بیخبری میں' عقائد پر حملہ ہو جاتا ہے' اور ایمان کی جڑیں ہل کر رہ جاتی ہیں۔ قاتل اگر ننگی تلوار نکال کر جھپٹے' تو سپر سے کام بہ آسانی لیا جا سکتا ہے' لیکن اگر کوئی "دوست" شربت کا گلاس پیش کرے' اور اس کی تہ میں' زہر ہلاہل کے ذرات جمے ہوئے ہوں تو کون اس سے بچ سکے گا؟ میٹھی چھری کاٹنے اور ہلاک کرنے میں' بہرحال چھری ہی ہوتی ہے۔

محبوبؐ سے خطاب

[illegible]

محبوبؐ سے خطابؐ

محسن کے ساتھ شقاوت

وہ جو اپنے وسیع ملک میں خدائے واحد کا پکارنے والا تھا، وہ جو اپنے دن پروردگار کی بڑائی بیان کرنے میں گزارتا تھا اور اپنی راتیں اپنے اسی اَن دیکھے مولا کی یاد میں رکوعوں میں جھک کر اور سجدوں میں گر گر کر بسر کرتا تھا، وہ جو اپنی عمرِ عزیز کے دنوں اور ہفتوں، مہینوں اور برسوں کو اپنی اسی ایک دھن پر واری کر چکا ہے، اُسے اپنے دوستوں اور اپنے عزیزوں، اپنی قوم والوں اور اپنے وطن والوں، اپنی برادری والوں اور اپنے کنبہ والوں کے ہاتھوں انعام یہ ملتا ہے کہ گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے، بدزبانیوں کا مینہ برسایا جاتا ہے اور اس کے دل کو چھلنی بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کو بھی اینٹ اور پتھر کا نشانہ بنایا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے پیر زخمی ہوتے ہیں اور اس کے پائے مبارک کی انگلیوں سے خون کی بوندیں بہتے اور ٹپکتے دیکھ دیکھ کر شقاوت آنکھیں تسکین حاصل کرتی ہیں۔

حق پر ثابت رہنے والے قدم

یہ پیر وہ تھے کہ ان پر دنیا جہان کے سارے سر بلندوں اور سر فرازوں کے سر قربان ہوں۔ یہ پیر وہ تھے کہ جو صرف راہِ حق کے طے کرنے اور عبدیت و عبادت پر ثابت رہنے کے لئے خلق ہوئے تھے ـــــ ان پیروں کی انگلیوں کو زخمی کیا گیا[۱] اور اللہ کے بندے کو مجبور

---

[۱] عام اہلِ تفسیر نے صرف اسی قدر لکھا ہے کہ حضورؐ کی انگلی میں چوٹ آگئی تھی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہا گیا کہ قیامِ شب کی عادت کو دو یا تین راتوں کے لئے ترک کر دے۔ ظالموں کو اس پر بس نہیں ہوتا، بلکہ ایک شیطان سیرت عورت، جو رشتے میں منچی بھی ہوتی ہے، آتی ہے اور کہتی ہے کہ "بھتیجے! معلوم ہوتا ہے، تیرے شیطان نے اب تجھے تعلیم دینا چھوڑ دی" (العیاذ باللہ) بندہ گو بہترین بندہ ہو، پھر بھی بندہ ہے، اور بشر، گو خیر البشر ہو، بہر حال بشر ہے، بندگی کا تقاضا، بشریت کا اقتضاء خیال قدرتاً یہ گزرا کہ، کہیں اس ذات نے جو ہمہ تن بے نیازی ہے، واقعۃً التفات ترک نہ کر دیا ہو۔

غم اور چارہ گری

یہ غم اُسے پیدا ہوا، جو دنیا کو غم سے نجات پانے کا راستہ دکھانے آیا تھا۔ ادھر اس فکر و غم کا پیدا ہونا تھا کہ ادھر عالمِ قدس میں جنبش پیدا ہو گئی۔ غم اگر بندہ کو تھا تو بندہ کا مالک تو غم کے دور کرنے سے عاجز نہ تھا۔

اضطراب اگر پیکرِ خاک کو ہوا تو تسکین کا نسخہ جانِ پاک سے تو کچھ دُور نہ تھا۔ نورانیوں کے سردار اور قدوسیوں کے پیشوا، جبرئیل امین خدمت سفارت پر مامور ہوتے ہیں اور ہفت افلاک کی منزلیں طے کر کے تسلی و تشفی کا یہ صحیفہ لے کر کسی کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، کہ غم و اضطراب کی کیا بات ہے۔

والضحیٰ

دن نکل آیا۔ ہدایت و نورانیت کا آفتاب طلوع ہو چکا۔ بشارت ہو کہ اس آفتاب کی کرنیں

(گزشتہ سے پیوستہ) لیکن ابن کثیرؒ نے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے بروایت حضرت جندبؓ صاف لکھا ہے کہ حضورؐ کی انگلی پتھر سے زخمی کی گئی تھی اور اس زخمی کئے جانے کی تائید اس شعر سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اس وقت پڑھا جس میں آپ نے اپنی انگلی کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تو اللہ کی راہ میں لہو لہان ہوئی ہے، اور جسے اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے۔

پھوٹ چکیں، اس کا اجالا گھر گھر پھیل چکا۔ وہ رب رحیم جو عالم کے جسمانی نشو ونما اور حیات مادی کی تکمیل کے لئے روزانہ آفتاب کو چمکاتا رہتا ہے، کیا انسان کی ربوبیت روحانی کے لئے آفتاب ہدایت کی روشنی نہ پھیلاتا؟ پس ہر روز آفتاب کے اُجالے کا ظہور خود تیرے منبع نور و ہدایت ہونے پر، تیری صداقت پر اور تیری رسالت پر گواہ ہے، اور محض شعاعوں والا دن ہی نہیں بلکہ سکون والی رات[1]، وہ رات جس کا کام وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۔۔۔۔ سکون دینا ہوتا ہے۔ وقت کا وہ تاریک حصہ جس میں ساری جاندار مخلوق سکون و آرام لیتی ہے، وہ بھی تیری ہی سچائی کا ایک نشان ہے۔ جو حکیم مطلق جانداروں کے آرام و آسائش کے لئے یہ وقت لاتا ہے، انسان کی ابدی راحت اور روحانی سکون کا سامان نہ کرے گا؟

آفتاب کا ظہور اور رات کا سکون، بجائے خود اس کے گواہ ہیں، اور زبان حال سے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۔۔۔۔ اس پر شہادت دے رہے ہیں کہ اے خلق کے غمخوار، تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے اور نہ وہ تجھ سے ناخوش ہے، یہ تیرے منکر اور تیرے حاسد اپنی بے بصری سے جو رائے تیرے متعلق چاہیں، قائم کریں، مگر یہ کہیں ممکن ہے کہ جس نے تجھے خلعتِ رسالت سے سرفراز کیا ہے، وہ تجھے چھوڑ دے یا تجھ سے ناخوش ہو جائے۔ وہ تو تیرا "رب" ہے۔ اس کی نسبتِ ربوبیت کا تو عین تقاضا ہے کہ وہ تیری تربیت کرتا رہے، اور جس غرض سے اس نے تجھے اپنا پیامبر بنا کر بھیجا ہے، اس کی تکمیل کے لئے لازمی ہے کہ وہ تیرے اوپر اپنی مسلسل و غیر منقطع رحمتوں کی بارش جاری رکھے۔ نادانوں نے یہ کہنا شروع کیا ہے کہ تیرے پروردگار نے تجھے چھوڑ دیا ہے اور تجھ سے ناخوش ہو گیا ہے۔ چھوڑ دینا اور ناخوش ہونا تو الگ رہا، تیرے رب کی تو تیرے حال پر اس درجہ شفقت و رحمت ہے کہ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۔۔۔۔ تیرے لئے تو ترقی ہی ترقی ہے۔ تیری آخرت تیری دنیا سے کہیں بڑھ کر اور تیری ہر پچھلی حالت تیری ہر پہلی حالت سے کہیں بڑھ چڑھ کر رہے گی۔ آخرت کا حال

---

[1] سجیٰ کے معنیٰ میں اہل تفسیر مختلف ہیں۔ لیکن ابن زید سے اس کے معنی سکون ہی مروی ہیں (تفسیر ابن جریر)۔۔۔۔ اور راغب نے بھی سجیٰ کے معنی "سکن" ہی لئے ہیں۔

تو جب معلوم ہوگا، لیکن اسی دنیا میں فتح و نصرت تو تجھے ابھی حاصل ہوتی ہے۔ آج جو تجھے ذلیل و خوار کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، کل وہ خود ذلیل و خوار ہوں گے، آج جو تجھے ستانا چاہتے ہیں کل وہ خود اسی مادی دنیا میں مٹ کر رہیں گے۔ مکہ تیرا ہوگا، مدینہ تیرا ہوگا، طائف کا سبزہ زار تیرا کلمہ پڑھے گا، خیبر کا قلعہ تیرے سپاہیوں کے نعرۂ تکبیر سے گونجے گا۔ تیرا جاہ و جلال ہر لحظہ، ہر آن ترقی کرے گا، اور تو ہی اپنی بیچارگی و بے سروسامانی کے ساتھ سارے سازوسامان والوں، سارے قوت و جبروت والوں پر غالب ہو کر رہے گا، یہ بدبخت اور کورباطن تجھے ہماری رحمت اور ہماری قربت سے دور سمجھ رہے ہیں۔ تو تو ہم سے اتنا نزدیک، اور ہمیں اتنا عزیز اتنا محبوب، اتنا پیارا ہے کہ ہماری رضامین تیری رضا میں ہے۔ تجھ پر ہمارے لطف و کرم کی اس درجہ بارش..... وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ..... ہے کہ تو خود ہمارے الطاف بیکراں سے سیر اور مطمئن ہو جائے گا، تیری طبیعت خود ہمارے عطایائے پیہم سے آسودہ ہو جائے گی، تو جو مانگے گا ملے گا۔ تیری جو خوشی ہوگی، پوری ہوگی۔ یہاں بھی اور وہاں بھی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، آج بھی اور کل بھی۔ یہ عطائیں اور بخششیں تیرے "رب" کی طرف سے ہوں گی۔ اس کی ربوبیت تجھے پورے منتہائے کمال تک پہنچا کر رہے گی، اور کمالات میں دنیا کے کمالات بھی شامل ہیں اور آخرت کے بھی۔ "آج" عطا و بخشش کا مشاہدہ یوں ہوگا کہ تیرے گنے چنے مفلس مرید اور فاقہ مست شاگرد اپنے سے دس گنے اور بیس گنے اور سو گنے سورماؤں پر، بڑے بڑے جتھے اور سرمایہ والے سرداروں پر غالب آئیں گے۔ مکہ کو فتح کریں گے، مدینہ پر حکومت کریں گے، یمن کو زیر کریں گے، عراق پر اپنا علم نصب کریں گے، مصر کو اپنا کلمہ پڑھائیں گے، قیصر کے قصرِ جہانداری کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، ایران کے پایۂ تخت کو ہلا کر رکھ دیں گے اور "کل" "تیرے کمالات کا ظہور اس رنگ میں ہوگا کہ جس وقت ابرار و اخیار لرزاں و ترساں ہوں گے، جس دم بڑے سے بڑے مقربین اپنے لئے متفکر و مضطر ہوں گے، جس گھڑی موسیٰ کلیمؑ و عیسیٰ مسیحؑ تک کی زبانوں پر نفسی نفسی ہوگا، اس آن اور اس گھڑی صرف لوائے حمد تیرے ہی ہاتھ میں ہوگا، اس وقت تیری ہی سنی جائے گی، اس وقت تیری ہی مانی جائے گی اور اس وقت تجھی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ آپ تو آپ، اپنوں میں سے، اپنے کہلانے والوں میں سے،

جتنوں کو چاہے گا ـــــ اور تو ان میں سے کس کو نہ چاہے گا؟ تو تو اپنے والوں پر "حریص" بھی ہے اور "رؤف" بھی اور "رحیم" بھی، حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔ سب کو اپنے ساتھ لگالے گا، آگ سے نکال لے گا، قہر و غضب سے بچالے گا۔[1]

اور یہ وعدے اور یہ بشارتیں تو خیر آئندہ کے لئے ہیں، انھیں دیکھنے کے لئے پھر بھی کسی قدر پیش بینی اور نور بصیرت کی ضرورت ہے، یہ منکر اور حاسد تو اتنے اندھے ہیں اور بصارت سے اس حد تک محروم ہو چکے ہیں کہ اب تک جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا ہے وہ بھی انھیں نہیں سوجھ پڑتا۔ اب تک اے یتیم! جو معاملہ تیرے ساتھ ہوا ہے وہ بجز محبوبوں کے کسی اور کے ساتھ بھی رہ سکتا ہے؟ کیا ان بے بصروں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس، أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۔ ۔ ۔ ۔ عالم ناسوت میں تیری آمد کس بے کسی اور کیسی بیچارگی کی فضا میں ہوئی

---

[1] عموماً مفسرین نے آیت کے معنی یہ لئے ہیں کہ تیری عاقبت تیری دنیا سے بہتر ہوگی، لیکن ابن عطیہ اور ایک گروہ مفسرین اس جانب بھی گیا ہے کہ 'بہتر حالت' کا تعلق اسی دنیا سے ہے، یعنی نزول سورۃ کے وقت جو حالت ہے اس سے کہیں بڑھ کر آئندہ ہوگی اور فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ ویحتمل ان یرید حالیتہ قبل نزول السورۃ وبعدہا وعدہ تعالیٰ بالنصر والظفر قال ابن عطیۃ۔

(بحر المحیط، ابن حیانؒ)

قاضی بیضاویؒ نے اس سے زیادہ تصریح کے ساتھ دینی ترقی کمالات کو اس میں شامل کیا ہے۔

نہایۃ امرک خیر من بدایتہ فانہ صلی اللہ علیہ وسلم لایزال یتصاعد فی الرفعۃ والکمال۔

وعد شامل لما اعطاہ من کمال النفس وظہور الامر واعلاء الدین ولما ادخر، کہ حالیعرف کنہہ سواہ (بیضاویؒ) ۔ ۔ ۔ ۔ قیل ولسوف یعطیک ربک من الثواب وقیل من النصر وکثرۃ المومنین فترضیٰ (بغوی) ۔ ۔ ۔ ۔ وحمل الآیۃ علی ظاہرہا علی ظاہرہا من خیری الدنیا والاخرۃ معا اولیٰ الخ (خازن) ۔ ۔ ۔ ۔ والاولیٰ ان ہذا موعد شامل کما اعطاہ فی الدنیا من الظفر و لما ادخرلہ من الثواب۔ (ابن حیانؒ)

تھی؟ دنیا بھر میں تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت کا اصلی ذریعہ باپ ہوتا ہے۔ تیرے پیدا ہوتے ہی تیرے سر سے یہ سہارا توڑ دیا گیا تھا۔ باپ کے بعد پھر بے غرض خدمت کرنے والی اور اپنے کو مٹا کر بچہ کو پرورش کرنے والی ہستی ماں کی ہوتی ہے، چند ہی روز بعد تجھے اس کے آغوش سے بھی جدا کر دیا گیا تھا۔ لے دے کے ایک سہارا دادا جان کا تھا، لیکن قبل اس کے، کہ تیرا بچپن ختم ہو، یہ سایہ بھی تیرے سر سے اٹھا لیا، اب تُو تھا اور تیری یتیمی، تُو تھا اور تیری بیکسی۔ نہ گھرانا کوئی خوشحال نہ تعلیم و تربیت کا کوئی سامان۔ پھر آخر بجز ہماری ربوبیت کے کس نے تیرا ہاتھ پکڑا ہے؟ بجز ہماری رحمت کاملہ کے کس نے تیری دستگیری کی؟ کس نے تیرے سر پر ہاتھ رکھا؟ کس نے تجھے ہر خطرہ سے بچایا؟ کس نے قدم قدم پر تیری حفاظت کی؟ کس نے تیری صورت، تیری سیرت تیری صحت، اور تیرے اخلاق کو ایسا سنوارا کہ تیرے ظاہر پر شہزادے اور امیرزادے، تیرے باطن پر حکماء و درویش رشک کرنے لگے؟ دشمنوں سے کس نے بچایا؟ ابولہب کی تلوار اور ابوجہل کے نیزے کو کس نے تجھ سے دور رکھا؟ پھر یہی نہیں بلکہ تُو بے تعلیم اور حرف ناشناس وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ[1] ..... جو خدمت خلق کی دھن میں، راہ نجات کی تلاش میں، تزکیۂ باطن کے فراق میں، غافل و بے خبر ادھر سے اُدھر سرگرداں پھرا کرتا تھا، کس نے تجھے بغیر کسی درسگاہ و کتب خانہ کی مدد کے، بغیر کسی مرشد و استاد کی وساطت کے۔ اپنی صاف اور روشن راہ دکھادی؟ کس نے علومِ لدنی کے صحیفے تیرے لئے کھول دیئے؟ کس نے تیرے قلب کا پردہ روشن کر دیا جو اگلوں اور پچھلوں میں سے کسی پر روشن نہیں ہوا تھا؟ یہ اگر ہماری ربوبیتِ کاملہ کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہو سکتا تھا؟ اور اسی طرح تُو جو ہر طرح پر محتاج تھا، تجھے تونگر و مستغنی کس نے بنا دیا؟ کیا بجز ہماری رحمت کاملہ و ربوبیت مطلقہ کے وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ..... کوئی اور شے تھی، جس نے خدیجۃ الکبریٰؓ کی خوشحالی میں تجھے شریک بنادیا، جس نے متمول صحابہ مہاجرین

---

[1] وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ، اے غیر مہتد لما سبق الیک من النبوۃ (راغب)
قال الحسن والضحاک وابن کیسان وَوَجَدَكَ ضَالًّا عن معالم النبوۃ واحکام الشریعۃ غافلاً عنہا فہداک الیہا۔ (بغویؒ)

کی دولتیں تیری نذر کرا دیں؟ تیرا قلب تڑپ رہا تھا کہ دنیا میں توحید باری کیونکر قائم کی جائے، تیرے قلب کو اس کے دلائل سے بھر دیا گیا، تیرے نفس کے فقر کو غنا[۱] سے تبدیل کر دیا گیا، تو خود اپنے مغفرت و نجات کی فکر میں[۲] ہم نے تجھے خود تیری ہی نجات کی طرف سے بے فکر نہیں کر دیا بلکہ اعلان عام کر دیا کہ جو بھی تیرا وسیلہ تلاش کرے گا، جو تیرے نام کا سہارا پکڑ کے آئے گا، اس کے لئے نجات ہی نجات ہے، کہاں ابھی خود اپنے لئے راہ تلاش کر رہا تھا، اور کہاں ابھی رہبر و رہنما ہی نہیں بلکہ دنیا جہاں کے رہبروں کا سردار اور رہنماؤں کا پیشوا بنا دیا گیا۔ یہ معاملات اگر خاص محبوبوں کے ساتھ نہیں تو کیا کسی اور کے ساتھ ہو سکتے ہیں؟ بے بصر منکروں اور حاسدوں کو، مستقبل نہ سہی، ماضی میں بھی تیرے مرتبۂ قرب کی یہ کھلی ہوئی نشانیاں نہ دکھائی پڑیں؟

یہ مرتبۂ محبوبیت سارے عالم کے محبوبوں میں سے کسی کو حاصل ہوا ہے؟ پھر یہ مراتب محبوبیت اب بھی ختم نہیں ہوتے، محبوبوں کی ذات ہی نہیں، ان کی ایک ایک صفت محبوب ہوتی ہے۔ ان کا ایک ایک وصف، محبت کی کائنات میں کیا کچھ درجہ رکھتا ہے۔ تو یتیم تھا، لے آج سے ہم کو خود یہ صفتِ یتیمی فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ..... محبوب ہو گئی ہے۔ آج سے کسی یتیم کے ساتھ سختی، بدسلوکی، بے مہری، بے اعتنائی ہمیں گوارا نہیں۔ جو یتیم سے بے مہری کرے گا، خود اس کے ساتھ بے مہری کی جائے گی، جو یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ نہ پھیرے گا، وہ خود شفقت و رحمت سے محروم رہے گا، جس کے دل میں یتیم کا درد نہ ہوگا، اس بے درد کے ساتھ بھی دردمندی نہ برتی جائے گی یہ اعلان ہماری کتاب میں ہمیشہ کے لئے کیا جا رہا ہے۔ ہماری کتاب یتیمی کی قدر و منزلت کی گواہ رہے گی، اور ہمارا دین یتیموں کے حقوق کا محافظ ہوگا۔ تو بہت دنوں تک راہ کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا، تو بہت روز تک اپنی تشفی کے لئے سائل بنا رہا، تو نے

---

[۱] وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى، اے ازال عنک فقر النفس وجعل لک الغنیٰ الاکبر

(راغب وتاج العروس)

[۲] ووجدک نقیصا الی رحمۃ اللہ وعفوہ فاغناک بمغفرۃ لک ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔

(راغب وتاج العروس)

بہت زمانہ بہ حیثیت سوالی کے بسر کیا اس کی یادگار واما السائل فلا تنہر میں یہ اعلان عام کیا جاتا ہے کہ سائل کی عزت کے ہم نگران ہیں۔ سوال کرنے والا ہرگز سختی و درشتی کے برتاؤ کا مستحق نہیں، بلکہ نرمی، آشتی و شیریں زبانی اس کا حق ہے اور راہ ہدایت کا ہر سرگرداں، حق کی راہ میں ہر بھٹکنے والا، علم صحیح کی تلاش میں ہر قدم رکھنے والا اس کا مستحق ہے کہ اس کی تشفی کی جائے۔ آج سے ہماری آسمانی کتاب زمین والوں کو حکم دیتی ہے کہ سوالی کے ساتھ لطف و مہربانی سے پیش آیئں۔ آخر ہر سائل کو عرب کے "سائل" اعظم سے کچھ نسبت و مناسبت تو بہر حال حاصل ہے" اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے تجھے محتاج اور بدرجۂ غایت محتاج پایا تھا۔ جس درجہ کی یہ محتاجی تھی، اسی درجہ کا غنا ہم نے اپنی عطا و بخشش سے مرحمت فرمایا، وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ...... اس دولت کا نام، دولت نبوت و قرآن ہے ہماری یہ نعمت چھپا کر رکھنے کی نہیں، خوب لٹانے اور تقسیم کرنے کی ہے، پس جہاں تک ممکن ہو اس دولت کو لٹاؤ، اس نعمت کا فیض عام جاری کرو، اور اس چشمۂ فیض سے ایک ایک کو مستفیض کرتے رہو۔

مکہ کے بے بس و بے کس یتیم!

غار حرا میں مراقبہ کرنے والے گوشہ نشین!!

دیکھ لی، تیرے مرتبہ کی بلندی دیکھ لی، تیری شان محبوبیت کا نظارہ کر لیا۔ خادموں اور غلاموں ہی نے نہیں، منکروں اور حاسدوں، بدباطنوں اور کورچشموں تک نے تیرے آفتاب اقبال کی چمک دمک دیکھ لی، جو تجھ سے ٹکرایا، مٹا دیا گیا۔ توڑ دیا گیا۔ پاش پاش کر دیا گیا۔ جو تیرے سامنے

---

[1] السوال استدعاء معرفۃ او مایودی الی المعرفۃ (راغب) قال ابو الدرداء والحسن وغیرہما السائل ہو السائل عن العلم والدین ولا سائل المال (بحر المحیط) وروی عن الحسن فی قولہ واما السائل فلا تنہر قال طالب العلم (معالم التنزیل، بغوی)...... السائل طالب العلم فیجب اکرامہ...... مطلوبہ (خازن)...... قال العلماء اما انا لیس بالسائل ولکن طالب العلم، نیشاپوری۔

جھکا، نوازا گیا، سر فراز ہُوا، اپنی مراد کو پہنچا۔ ابو جہل اور فرزندِ خطّاب، دونوں تیرے حق میں یکساں تھے۔ ابو جہل نے تجھ سے دشمنی کی، اپنے آپ سے دشمنی کرلی۔ عقل و دانش نیک نامی اور اقبال مندی، آفتاب و ماہتاب، زمین و آسمان سب اُس کے دشمن ہو گئے۔

فرزندِ خطّاب نے اپنا سر تیرے آگے جھکا دیا، سب اس کے آگے جُھک گئے۔ جزء اُنے جُھکے، فوج و لشکر جھکے، اقبال و حشم جھکا، ناموری و اقبالمندی جھکی، شام و ایران، مصر و عراق کے تخت و تاج جھکے، ایک عالم کا عالم صولتِ فاروقی کے آگے جُھک گیا۔

فقرِ محمدیؐ

فقرِ محمدی

فقرِ محمدی

پرانے مشائخ طریقت میں ایک بزرگ شیخ احمد بن ابراہیم الواسطیؒ گزرے ہیں، جنکو شیخ عبدالحق دہلویؒ 'عالم عامل' اور 'عارف کامل' کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ :

"از کبار مشائخ دیار عرب بود، و مقتدائے روزگار، در طریق اتباع سنت و تقویم و ترویج ایں طریقہ بے نظیر وقت بود۔"

ترجمہ :

"عرب کے مشہور مشائخ میں سے تھے اور اپنے زمانہ کے پیشوا۔ اور پیروی سنتِ رسولؐ، اور اس کے پھیلانے میں، اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے۔"

ان بزرگ کا عربی میں ایک رسالہ "الفقر المحمدیؐ" کے نام سے ہے۔ شیخ دہلویؒ کو ایک نسخہ اس کا ہاتھ لگ گیا، اس کا فارسی ترجمہ انھوں نے "تحصیل الکمال الابدی باختیار الفقر المحمدیؐ" کے نام سے کر دیا، جو ان کے مطبوعہ رسائل و مکتوبات میں منسبہ پانچ پر شائع ہوا ہے۔ آج تصوف کے بہت سے دشمن اور مخالفین اور بہت سے دوست و موافقین، اس کو شریعتِ اسلام سے علیحدہ کوئی مستقل نظام سمجھ رہے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے حق میں، شاید اس کے بعض مطالب کا مطالعہ مفید ہو۔ ترجمہ لفظی نہیں۔ عنوانات میرے اضافہ کئے ہوئے ہیں، اور مضامین کی ترتیب بھی میری ہی قائم کی ہوئی ہے۔

تصوّف کا اصل اصول

اگر سچی درویشی اور اصلی فقیری کی طلب ہے، جس کی جڑ مضبوط اور جس کی شاخیں بلند ہوں، تو لازم ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کی فقیری اور درویشی کو اختیار کرو، اور انہی کی پیروی کرو کہ صاف اور پاکیزہ پانی وہیں ملتا ہے، جہاں سے چشمہ پھوٹتا ہے، اور بعد کے آنیوالوں کی درویشی کو اختیار نہ کرو کہ پانی سرچشمہ سے دور جا کر گندلا ہو جاتا ہے، اور اس کا رنگ اصلی باقی نہیں رہتا۔

اس مسلک کا انجام

اس طریقۂ محمدیؐ پر اگر قائم رہے تو امید ہے کہ اگلوں سے جا ملو گے، جو پیغمبرِ خدا صلعم کے اصحاب میں سے تھے، اور قیامت کے روز پیمبرؐ کے جھنڈے کے نیچے، پیمبرؐ و یارانِ پیمبرؐ کے ساتھ تمہارا حشر ہوگا۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ دوسرے اپنے اپنے شیوخ اور مرشدوں کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے، لیکن تمہارے اوپر اس وقت تمہارے شیخؐ یعنی حضور رسول خدا صلعم کے جھنڈے کا سایہ ہوگا۔

تصوف کے معنی

لوگوں کی زبان پر آج فقر فقر ہے، لیکن اس کی حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ نہ یہ جانتے ہیں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے اور نہ یہ خبر ہے کہ اس کی انتہا کیا ہے؟ اگر فقر کے معنی سمجھ میں آجائیں اور اس کے ابتدائی مدارج کا علم ہو جائے تو اس پر اس کی انتہا کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ فقر کے میدان میں قدم رکھنا صرف اسی وقت ممکن ہے جب ممنوعات سے بچنے اور احکام کی تعمیل پر قدرت حاصل ہو لے۔

لازمی شرطیں

اس رنگ میں ڈوبنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ جس طرح متقی اپنے جسم کو گناہ سے

محفوظ رکھتا ہے اسی طرح فقیر اپنے دل کو خیالِ گناہ سے محفوظ رکھے، اور اگر دل میں کبھی کوئی خطرہ پیدا ہو تو فوراً اس سے توبہ کرے۔ فقیر ایسے ہی ہوتے ہیں، جن کے دلوں میں مرضئ خدا کے خلاف کسی خطرہ کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ انہیں اس امر سے شرم ہوتی ہے کہ خدا کی دوستی کا دعویٰ کر کے کسی غیر خدائی خیال کو دل میں آنے دیں۔ یہ فقر کا ابتدائی مرتبہ ہے، جب تک یہ قدرت نہ حاصل ہو لے، زبان پر فقیری کا نام لاتے ہوئے بھی شرمانا چاہیئے۔

گناہ سے بچنے، احکام کی پابندی کرنے اور دل کو خطرات اور وساوس سے محفوظ کر لینے کے بعد، دوسری شرط فقیر کے لئے یہ ہے کہ خدا کی طلب و محبت دل پر اتنی غالب آجائے اور طبیعت خدا کی محبت سے اس قدر مغلوب ہو جائے کہ دنیا کے تمام فوائد و منافع بالکل جل جائیں، اور ان کا خیال تک نہ آنے پائے، دل کو محض محبوبِ حقیقی و مطلوبِ اصلی کے لئے مخصوص ہو جانا چاہیئے اور ماسوا سے بالکل خالی ہو جانا چاہیئے۔ جب تک یہ کیفیت نہ طاری ہو جائے فقیری کا دعویٰ کرنے سے شرمانا چاہیئے۔

کاملین کا مرتبہ

اوپر جو شرطیں بیان کی گئیں، یہ مبتدیوں کے لئے ہیں۔ جب دل کو انہیں کے سننے کی تاب نہیں، اور ان پر عمل کی توفیق نہیں، تو کاملین کے مرتبہ کمال کو وہ کیونکر سمجھ سکتا ہے اور اس کی تشریح اس مختصر رسالہ میں کیسے کی جا سکتی ہے۔ صرف ان کے مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جھوٹے مدعی

رونے کا مقام ہے کہ ہم میں ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو حرام کھاتا ہے اور باطل میں مشغول رہتا ہے۔ جو ان لوگوں کو مل جائے وہی ان کے نزدیک حلال ہے اور جو نہ ملے وہی حرام ہے۔ دن رات انہیں یہ دھن سوار رہتی ہے کہ لذیذ غذائیں کھانے کو، خوبصورت چہرے دیکھنے کو اور نغمہ کی آوازیں سننے کو ملتی رہیں۔ اور اسی دھن میں یہ بڑے بڑے دعوے زبان سے نکالتے ہیں، اور اپنے میں وجد و حال ظاہر کرتے ہیں، تاکہ عوام ان کے معتقد ہوں، اور انہیں دنیا کچھ اور ہاتھ آئے۔ ان لوگوں کو نہ حلاوت

اسلام سے واسطہ نہ لذتِ ایمان سے سروکار، ساری ساری رات رقص و سماع میں معروف رہتے ہیں اور نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو گویا ٹکریں مار کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور امیروں اور بادشاہوں کے ہاں کی آمد و رفت، اور ان سے نذریں حاصل کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کے شر سے بچائے کہ دنیا کے رہزنوں سے کہیں بڑھ کر یہ دین کے رہزن ہیں۔ دنیا کا رہزن مال لے جاتا ہے، اور یہ دولتِ ایمان پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ عوام پر ان کے لباسِ فقر کا اثر پڑتا ہے، اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ فقیری اسی کا نام ہے۔

سچے فقیر کی علامات

محمدی فقیروں کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے ذوق سے مست رہتے ہیں، اور اس کی آواز پر وجد کرنے لگتے ہیں، اور اس کے سننے کے وقت ان پر خود متکلم (یعنی خدا) کی تجلیوں کا عکس پڑنے لگتا ہے۔ کیسے غضب کی بات ہے کہ جس محبوب کی محبت کا دعویٰ کیا جائے، اسی کے کلام میں لطف نہ آئے، اس کے لئے طبیعت حاضر نہ ہو، اور لطف آئے تو شعر و قصیدہ پر گانے بجانے پر، اور تالیوں پر۔

سماع اور قرآن

اللہ کے دوستوں اور عاشقوں کے لئے ساری لذت حلاوتِ قرآن میں ہے، اور ان کے دلوں کی راحت و تسکین کا سامان اسی میں ہے۔ کلام کے ساتھ ہی ان کا دل متکلم سے وابستہ ہو جاتا ہے، اور قرآن کے احکام و قصص، مواعظ و اخبار، وعد و وعید کو سنتے ہی ان کے دلوں میں گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اور متکلم کی عظمت میں وہ اپنی ہستی گم کر دیتے ہیں۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ شعر کو نہ کہ قرآن کو، طبیعت بشری سے خاص مناسبت ہے۔ اس لئے اشعار کو سن کر دل میں قدرتاً تحریک پیدا ہوتی ہے، سو یہ قول لغو و بے حقیقت ہے، اس لئے کہ شعر کے وزن اور موسیقی کے تال سُر پہ حرکت کرنا جبلتِ حیوانی کا تقاضا ہے، چنانچہ حیوانات اور بچے، سب اچھی موسیقی سے اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ فطرتِ حیوانی ہے۔ انسان کی اعلیٰ فطرت کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے۔ جن کے

دلوں میں ایمان گھر کر چکا ہے' اور محبت الٰہی حلاوت حاصل کر چکی ہے' جیسا کہ حضرات صحابہؓ اور ان کے بعد کے آنے والوں کا حال تھا' سو ان کے قلب کو حرکت میں لانے والی' اور ان کے شوق' وجد رقت' اور خشوع کو بڑھانے والی شے' قرآن پاک کی سماعت ہی ہو سکتی ہے۔

عملی ہدایات

صحیح تصوف یا فقرِ محمدیؐ میں قدم رکھنے والے کے لئے عملی ہدایتوں میں سے پہلی شے یہ ہے:

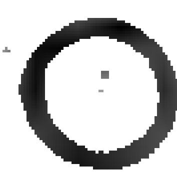
اپنے پروردگار کے سامنے' جس نے قرآن اور رسولؐ جیسی پاک نعمتیں اتاری ہیں' صدقِ دل سے توبہ کرنا' پھر تنہائی میں جا کر' سب کی نظروں سے الگ' وضو کر کے دو رکعتیں خشوع قلب کیساتھ پڑھنا' اس سے فارغ ہو کر ننگے سر' ہاتھ باندھے ہوئے اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر اتنی دیر تک کھڑے رہنا کہ دل میں گداز' پیدا ہو جائے' اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں' اس وقت رو رو کے توبہ استغفار کرنا' اور الفاظ حدیث کے مطابق سید الاستغفار پڑھنا' پھر طریق پیروی رسولؐ پر قائم و منضبط رہنے کے لئے توفیق چاہنا اور آئندہ کے لئے مضبوط عہد کرنا کہ آنکھ' کان' زبان' شکم' شرمگاہ اور ہاتھ پیر ہر قسم کے گناہ سے محفوظ رہیں گے' ایسا کہ جب دن ختم ہو تو نہ زبان کسی کی بدگوئی' جھوٹ' بدزبانی وغیرہ سے آلودہ ہوئی ہو نہ کان نے کوئی بیجا بات سنی ہو' اور نہ آنکھ کسی ایسی چیز پر پڑی ہو' جس کا دیکھنا شرعاً پسندیدہ نہ تھا' اور نہ خالق و مخلوق میں سے کسی کا حق اپنے اوپر باقی رہنے پائے۔

عملی ہدایات کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ نماز باجماعت اپنے ارکان و آداب و حضورِ قلب وغیرہ کی پوری پابندیوں کے ساتھ ادا کی جائے' ایسی کہ حدیث میں جو لفظ "احسان" آیا ہے' اس کی پوری عملی تفسیر ہوتی رہے۔ حال صحیح وہی ہے جو حالتِ نماز میں طاری ہو۔ بندہ اور پروردگار کے درمیان رابطہ پیدا کرانے والی شے نماز ہے' پس اگر نماز میں حضورِ قلب نہیں پیدا ہوتا تو اس کا کوئی حال معتبر نہیں' اس لئے کہ جس بندہ کے حجابات' ایسی منزل قرب میں بھی پہنچ کر دور نہیں ہوتے اس کے لئے کسی دوسرے موقع پر اس کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ بخیف ہے کہ سماع شعر کے وقت تو قلب حاضر ہو' لیکن جو وقت عین حضوریٔ حق کا ہوتا ہے' اسی وقت غائب ہو۔ ایسی فقیری

فاسد اور ایسی درویشی ناجائز۔

بنیادِ کار

سچے تصوف کی ساری بنیاد رسول کریم صلعم کے ساتھ محبت و ربطِ قلب پیدا کرنے پر ہے اپنے دل کو اس ذاتِ گرامی کی محبت میں اٹکایا جائے، اسی کو اپنا شیخ اور اپنا امام بنایا جائے، اسی کے نام پر بکثرت درود و صلوٰۃ بھیجا جائے اور اسی کے ساتھ پیوندِ محبت مستحکم کر لیا جائے۔ تمام درویشوں کو دیکھا ہوگا کہ ان کے دلوں میں ان کے مرشدوں کی عظمت ایسی بیٹھ جاتی ہے کہ وہ جب کبھی اپنے شیخ یا مرشد کا نام سنتے ہیں تو بے چین ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت، یہی نسبت قلب، سچے درویش کو رسول کریم صلعم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ پیدا کر لینی چاہیے۔ اپنا امام اور شیخ اُن ہی کو بنانا چاہیے، دل میں خیال آئے تو انھیں کا، آنکھوں میں صورت پھرتی رہے تو انہی کی، کان لذت حاصل کریں تو انہی کے نام مبارک سے، عظمت کا احساس پیدا ہو تو انہی کے ذکر سے، زبان انہی پر درود بھیجنے میں لگی رہے، دل میں انہی کے حالات سننے اور جاننے کا ذوق پیدا ہو، حدیث و آثار کے پڑھنے سے علاقۂ محبت کو اور ترقی ہو، شوق و اشتیاق ہو تو انہی کا، یاد ہو تو انہی کی، پیروی ہو تو انہی کی، ہر امر میں انہی کے حکم کی تعمیل اور پیروی کا شوق غالب ہو، اور ان کی پیروی میں اتنی شدت برتی جائے کہ ہر شخص دیکھتے ہی "محمدی" سمجھ لے۔



رسالہ کے اہم اور ضروری مطالب کا ملخص سطور بالا میں آ گیا۔ شیخ عبدالحق دہلویؒ ان تمام مطالب کو نقل کرنے کے بعد خود بھی ان کی پُرزور تائید کرتے ہیں۔

کیا اہلِ شریعت اس میں کوئی امر اپنے عقیدہ کے خلاف پاتے ہیں؟

کیا اہلِ طریقت کو اس میں کہیں حرف رکھنے کی گنجائش ہے؟

کیا کسی گروہ کو کوئی وجہ اعتراض ہے؟

ہمارے سچے رسولؐ کی زبان سے یہ پیام دنیا کو پہنچا تھا، کہ غیر مسلم، اگر خدا ئے واحد و یکتا

کی پرستش پر متفق ہو جائیں تو مسلمانوں سے فوراً صلح ہو سکتی ہے۔ اگر آج سارے اسلامی فرقے' رسولِ خاتم و برحق کی محبت و اطاعت کے مرکزی نقطے پر آ کر جمع ہو جائیں تو آپس کی رنجش و نقیض ردو کد کے لیئے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے۔

صابرِ رسُولؐ

صابر رسولؐ

انسانیت کے لیے ہر مصیبت میں تعزیت و تسلّی کا پیام اور صبر و رضا کا نمونہ

خلقِ عظیم کا ایک خاص پہلو

اصلاح اور مصیبتیں

جتنے مصلحین دین کی فلاح و بہبود کا نقشہ لے کر اٹھے کس کی آؤ بھگت گالیوں رسوائیوں سے، تکفیر و تفسیق سے، ضرب و بند سے نہیں ہوئی۔ کیا ابو حنیفہؒ قید میں نہیں ڈالے گئے؟ کیا احمد حنبلؒ کی پیٹھ سے خون کے شرارے خود مسلمانوں کے کوڑوں سے نہیں بہے؟ کیا غزالیؒ کی کتابیں آگ کے ڈھیر میں خود مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں جھونکی گئیں؟ کیا اسمٰعیل شہیدؒ پر کفر کا فتویٰ نہیں لگا؟

کیا ان سب کی مصیبتیں اور بپتائیں الگ الگ نہیں، ملا کر اور سب ایک میں شامل کر کے بھی اس ایک انسان کے مقابلہ میں لائی جا سکتی ہیں، جو مخلوق کے اوّلین و آخرین میں سب سے بڑا بنا کر بھیجا گیا تھا؟ لیکن جس کو دن دو دن نہیں، ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ دو مہینہ بھی نہیں، تیرہ سال تک مسلسل و یک لخت، دنیا کے شریروں اور رذیلوں سے، گندوں اور کمینوں سے، شرابیوں اور جواریوں سے، لٹیروں اور حرام کاروں سے، پتھروں کے پوجنے والوں اور درختوں کو سجدہ کرنے والوں سے، انسانی سانپوں اور اژدہوں سے، انسان صورت بھیڑیوں اور

درندوں سے، دب کر اور جھک کر رہنا پڑا۔ آج شہر کے کسی رئیس، کسی حاکم، کسی چودھری کو کوئی چوہڑ چمار ذرا گالی دے کر تو دیکھے، یہاں گالیاں کھلوائی گئیں۔ اُسے جو سارے معززین سے معزز تر، سارے وجاہت والوں سے بڑھ کر وجیہہ، اور سارے شریفوں سے اشرف تھا، ان کی زبانوں سے جو ذلیلوں سے بڑھ کر ذلیل، گندگی میں اپنی آپ نظیر اور رذیلوں میں بھی ارذل تھے۔ اور جس جسدِ مبارک کو ادب و احترام کے ساتھ مس کرنا، نور کے بنے ہوئے فرشتوں کے لیے بھی باعثِ فخر و شرف تھا، اس کے ساتھ کیسی کیسی گستاخیاں اور دراز دستیاں وہ جہنم کے کندے کرکے رہے۔ جنہیں آگ میں جلنا اور آگ میں ملنا تھا۔ جسے آسمان والے نے محمدؐ (ستودہ صفات۔ تعریف کیا گیا) بنا کر بھیجا تھا، گندہ دھن زمینی مخلوق اُس کے ساتھ کسطرح پیش آئی۔ کیا اسے جی بھر کے چڑھایا نہیں۔ طرح طرح کے آوازے نہیں کسے؟ ڈھیلے نہیں برسائے؟ ساقِ مبارک کو لہولہان نہیں کیا؟ کھانا پانی بند نہیں کیا؟ ہر طرف سے گھیر کر ایک غار میں بند کرکے، فاقہ کشی کی نوبت نہیں پیدا کر دی؟ دوستوں اور مخلصوں، جاں نثاروں اور سرفروشوں پر کیا کیا قیامتیں بپا ہوکر نہیں رہیں؟ غرض تکلیف و تعذیب، توہین و تحقیر، آزارِ جسمانی و روحانی کا کوئی پہلو اٹھ رہا؟ تاریخ کے کس واقعہ سے انکار ہوگا؟ اور پھر اس ذاتِ پاک کے صبر میں، ہمت میں، استقامت و استقلال میں کس وقت، کس لمحہ، کس آن فرق پڑنے پایا ہے؟ آپ اپنی تکلیف کو جھینکتے پھرتے ہیں، ہے کوئی جو اس بڑی مثال کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر سکے؟ اس پہاڑ کے سامنے، اپنے ریت کے گھروندے کو لائے؟ اس بے مثال 'مثال' کو سامنے رکھ کر ارشاد ہو کہ کس نے دین کی راہ میں کیا کیا ہے؟ کیا سہا ہے؟ کیا کھویا، کیا لٹایا، کیا اٹھایا ہے؟

مظالم اور اُسوۂ محمدیؐ

مظلومیت و غربت، بیکسی اور بے بسی، ہم پر، آپ پر، آج کسی درجہ میں طاری ہو، اسوۂ محمدیؐ سے بڑھ کر کون اسوہ ملے گا؟ تسکین و تسلّی کے لئے اس ذات کے سوا اور کہاں سامان نظر آئے گا؟ لیکن فراغت و غلبہ کے وقت بھی کیا اس کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے پائے گا؟

اچھا تو یہ بتائیے کہ سرداری دو فتحمندی کی حالت میں کبھی اس سرداروں کے سردار کے قدم نے عبدیت کے حدود سے ذرا بھی تجاوز کیا ہے؟ انتہائے مشغولیت میں بھی کبھی غفلت طاری ہوئی ہے؟ بڑی سے بڑی جنگ اور معرکہ آرائی کے وقت رسد کا سامان اور روپیہ کا انتظام، گھوڑوں کی فراہمی اور ہتھیاروں کی خریداری، میدانِ جنگ کا انتخاب اور صفوفِ لشکر کی ترتیب، کوچ کا حکم اور قیام کا ارشاد، فوجوں کا لڑانا، صلح کے شرائط طے کرنا، مالِ غنیمت کی تقسیم اور ملوک وسلاطین سے نامہ و پیام، یہ سارے کام جن کے لئے آج بیسیوں ماہرین خصوصی کی ضرورت ہوتی ہے، کمسریٹ والوں، انجینئروں کی، جنرل اور مدبر کی، خدمات بنفس نفیس ہی انجام دیتے تھے، اور ممکن نہ تھا کہ ان میں پڑ کر کسی وقت کی نماز رہ جائے، معمولاتِ عبادت میں فرق آجائے۔ پھر آج کسی کے مشاغل کیا ان سے زائد ہو سکتے ہیں؟ کس کی مشغول زندگی اس مقابلہ میں لانی ممکن ہے؟

تھکا دینے والے مشاغل اور صبر واستقامت

جنگ کی حالت چھوڑیئے، امن کا زمانہ لیجئے۔ ابھی طائف مسلمان ہو رہا ہے۔ ابھی یمن کے اسلام کی خوشخبری آرہی ہے۔ ابھی بحرین اسلام قبول کر رہا ہے۔ ابھی عمان اطاعت قبول کر رہا ہے۔ ابھی مزینہ کا وفد آرہا ہے۔ ابھی بنو تمیم کی سفارت پہنچ رہی ہے۔ ابھی قیصر و کسریٰ کے نام خطوط روانہ ہو رہے ہیں۔ ابھی شاہِ مصر کو دعوتِ اسلام بھیجی جارہی ہے۔ فلاں قبیلہ پر جزیہ کی تشخیص ہو رہی ہے۔ فلاں نومسلم آبادی پر زکوٰۃ کی تعیین کی جارہی ہے۔ ادھر دعات و موذنین کا تقرر ہو رہا ہے، ادھر مختلف شہروں اور صوبوں کے لئے حکام و ولات مقرر کئے جارہے ہیں۔ ابھی غیر ممالک کے قاصدوں سے گفتگو ہو رہی ہے، ابھی مقدمات کے فیصلے صادر فرمائے جا رہے ہیں۔ مریضوں کی عیادت ہو رہی ہے اور ساتھ ہی احتساب کا کام بھی جاری ہے، اور پھر تسبیح و تہلیل میں فرق آنے پاتا ہے نہ شب بیداری و تہجد گزاری میں۔ وہی مناجاتیں اور گریہ وزاری کے ساتھ عبادتیں، اور وہی راتوں کو کھڑے ہو ہو کر اتنا قرآن پڑھنا کہ پائے مبارک پر ورم ہو ہو آئے۔ آج ذرا سی مشغولیت کسی کو پیش آجاتی ہے تو جھٹ نوافل کیا معنی، فرائض تک کے ترک کا حیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ ادھر یہ نظیر موجود ہے کہ اس بعید و حساب

مشغولیت کے باوجود تعلق مع اللہ کے آثار ظاہری میں سرِ مو فرق نہیں۔ جنگ ہو یا صلح فوجی خدمات ہوں یا ملکی مناصب، زمینداری ہو یا ریاست، کاشت کاری ہو یا تجارت، کلکٹری ہو یا ججی، منسٹری ہو یا گورنری، انسانی زندگی کا کونسا رُخ ایسا ہے جس کے لئے وہ آفتابِ ہدایت دلیلِ راہ نہیں؟

بہترین رفیقِ حیات کا صدمہ

بیوی اور چہیتی بیوی، شوہر کے ہاتھوں اٹھ جانا، شوہر کے لئے کس قدر روح فرسا واقعہ ہوتا ہے۔ رفیقِ حیات جس سے دل ملا ہوا ہو، جس نے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں ساتھ دیا ہو، اسے اپنے ہاتھوں کفنانے دفنانے کی ہمت کوئی کہاں سے لائے، بجا ہے۔ لیکن ذرا خیال اللہ کے اس لاڈلے بندے کی طرف بھی جائے جس نے خدیجۃ الکبریٰ رضی جیسی عزیز اور عزیزالوجود، محبوب و وفا سرشت شریکِ حیات کو ۲۲، ۲۴ سال کی رفاقت کے بعد اپنے ہاتھ سے کھویا! اور اللہ کی مشیت پر صبر کیا۔ کیا آپ میں سے کسی کا رنج اس رنج سے بڑھ کر، کسی کا صدمہ اس صدمہ سے زائد ہے۔ جب اسے کلیجہ پر پتھر رکھنا پڑا، جس کی مرضی خود مرضی الٰہی کو منظور رہا کرتی تھی۔۔۔۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ۔ تو پھر ہم اور آپ، یہ اور وہ، زید اور بکر کس شمار میں ہیں۔ تسکین اگر ہوگی، تو پھر اپنے اسی بڑے کی مثال کو دیکھ کر۔ قومی زندگی سے قطع نظر کیجیے، خانگی زندگی کے مصائب و نوائب میں بھی، اس ایک کے سوا اور کس کا سہارا پکڑے گا؟

ازدواجی زندگی کا ایک اور غم

اس کے برعکس صورت بھی کچھ کم روح فرسا نہیں۔ نوجوان بیوہ کس طرح چاہنے والے، ناز اٹھانے والے، شوہر کے داغِ مفارقت کو برداشت کرے۔ کس طرح اپنے بے قرار دل کو قرار دے؟ آیئے ایک بار پھر اسی عالمگیر دواخانہ کی طرف رجوع کریں۔ مائی زینب رض اور مائی ام سلمہ رض وغیرہا کو چھوڑیئے، خود عائشہ صدیقہ رض جیسی کم عمر اور شوہر کی لطف و محبت کی خوگر بیوہ پر آخر کیا گزری

تھی؟ صبر انہیں کیسا آیا؟ کیا جو وقت ان پہ ڈالا گیا اس سے بڑھ کر کوئی وقت کسی دوسری حوا کی بیٹی پر پڑ سکتا ہے؟ یہاں تو سہاگ لٹتے وقت صرف ایک چاہنے والے شوہر ہی کا غم ہوگا، وہاں صدمہ کس کا اٹھانا پڑا تھا، ایسے شوہر کا جو رسولؐ اور پھر سب رسولوںؑ کا خاتم، سب رسولوں کا سردار۔ اس دکھ کا کوئی علاج، اس صدمہ کا کوئی عوض، تصور میں بھی آسکتا ہے؟ آج بڑی سے بڑی غمزدہ مسلمان بیوہ بھی، عائشہ صدیقہؓ کی بیوگی کو دیکھے، اور ذرا اپنے سوگ کا ان کے سوگ سے مقابلہ کرے؟ انشاءاللہ بے قرار دل کو قرار از خود آجائے گا۔

اولاد کا صدمہ

شوہر اور بیوی سے بڑھ کر جانگسل صدمہ اولاد کا ہوتا ہے۔ کسی کے کلیجہ کو گرم گرم لوہے سے داغ دیا جائے اور کہا جائے کہ زبان سے آہ اور دل سے شعلہ نہ اٹھنے پائے، تو اس پر کیا گزر کر رہے گی؟ یہاں جس کے سر پر دین و دنیا کی سرداری کا تاج تھا اس نے اپنے ہاتھوں ننھے اور معصوم ابراہیم اور دو دوسرے پیارے نبی زادوں کو نہلایا، کفنایا، جو ساری دنیا کے مسلمانوں کے حق میں رؤف و رحیم تھا، جو دشمنوں تک کے لئے رحمت و شفقت تھا کیا خود اپنی اولاد کے حق میں اس کا دل پتھر کا تھا۔ کیا اس کے دل سے ماتا نکال ڈالی گئی تھی۔ دل پر جو گزر رہی تھی، دل والا جانے یا دل کا پیدا کرنے والا، خادموں اور جانثاروں نے یہ دیکھا کہ قبل موت، ننھے لخت جگر کے منہ پر منہ رکھے شفیق باپ، اور ہم سب کا شفیق روحانی باپ، بوسہ پہ بوسہ لے رہا تھا۔ اور بعد موت جب قبر میں اپنے ہاتھ سے اتارا ہے، تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور زبان پر یہ فقرہ تھا کہ:

"اے ابراہیم! ہم تیرے غم میں رو رہے ہیں!"

آج دنیا کا کون باپ اپنی مصیبت کو اس سے بڑی مصیبت بتا سکتا ہے؟

کفار اور مشرکین مدتوں کے دشمنوں اور منکروں کا گروہ طعنہ دینے کو مستعد کہ کیسے نبی ہیں کہ اولادِ نرینہ کا سلسلہ بھی موقوف ہو رہا ہے۔ متعدد لختِ جگر پہلے پیوند خاک ہو چکے ہیں، آخری فرزند دلبند رخصت ہو رہا ہے کسی کی مصیبت اس مصیبت سے بڑی ہوگی؟ کس کا دھیان

اس حزن سے بڑھ کر ہوگا؟

جوان اولاد کا غم

اولادیں سب کی سب بچپن ہی میں رخصت نہیں ہوئیں۔ رقیہؓ اور ام کلثومؓ نبی زادیاں پل کر اور بڑھ کر، بالغ اور جوان ہو کر، اور یکے بعد دیگرے عثمان غنیؓ کی بیوی بن کر دنیا سے رخصت ہوئیں اور جو سارے عالم کو حیاتِ جاودانی کی بشارت دینے آیا تھا، اس نے اپنی جوان جہان بیٹیوں کی حیات ناسوتی ختم ہوتے، انہیں دم توڑتے، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے لاشے اپنے ہاتھوں قبر میں اتارے۔ اب اس کے بعد کون ہے جو اپنی جوان اولاد کے غم میں اپنے کو سب سے زیادہ غم نصیب سمجھتا ہے۔ آیئے اور تسکین کا مرہم اپنے زخم جگر پر اس بے خطا دواخانہ سے حاصل کیجئے۔

عزیزوں اور جاں نثاروں کے صدمے

بیوی اور اولاد کے غم کے بعد پھر دوسرے عزیزوں، دوستوں کی وفات کے صدمے ہوتے ہیں، امت میں قیامت تک جس کسی کو یہ صدمے ہوں وہ آئے اور صبر، اس کی مثال کو دیکھ کر حاصل کرے، جس نے ابو طالب کی موت کا، حمزہؓ کی موت کا، جعفر طیارؓ کی موت کا، شہدائے بدر کا، شہدائے احد کا، اور اپنے بیسیوں دوسرے مخلص خادموں اور جاں نثاروں کی موت کا صدمہ اٹھایا اور صبر سے کام لیا۔ رسولؐ کے صدمات کے بعد کس کا صدمہ انوکھا رہ جاتا ہے؟ رسولؐ کے غموں کے بعد، کس کا غم بلا تعزیت رہ جاتا ہے؟

عسرت اور فاقہ کے مصائب

موت کے صدمات سے ہٹ کر آیئے، تو پھر غم افلاس کا نمبر آئے گا۔ ایک خلقت کی خلقت ہے کہ معاش کی تکلیف میں مبتلا، اپنے نصیبوں کو کوس رہی ہے۔ امت کے ان دکھیاروں کو بشارت دیجئے کہ ذرا نظر اٹھا کر اس کے جمال جہاں آرا کی جھلک دیکھ لیں۔ جو امیروں کا امیر

اور سردار بناکر بھیجا گیا ہے مگر حالت یہ ہے کہ اتنی کئی وقت گھروں میں چولہا تک نہیں جلتا۔ فاقوں پر فاقے ہو رہے ہیں۔ اور پیٹ پر بھوک کی شدت سے پتھر بندھے ہوئے ہیں اور مسلسل فراغت کے ساتھ کھانا تو شاید کبھی تین وقت سے زائد قسمت میں آتا ہی نہیں۔ کون کی مفلسی اس مفلسی سے بڑھ کر ہے؟ کون بھوکا آج اتنا بھوکا ملے گا کہ پیٹ پر پتھر بندھے ہیں، اور وہ کام کاج، دوڑ دھوپ میں مشغول ہو، بھوک اور معدہ کی کھرچن، عسرت و ناداری، فقر و فاقہ کے مارے اور ستائے ہوؤ! رسولؐ اسلام کی آواز پر لپکو، کہ اس آواز دینے والے سے بڑھ کر کوئی غمخوار، کوئی صحیح معنی میں ہمدرد کہیں نہیں ملے گا۔

جسمانی تکالیف

اب اس امتی کو لیجیے جو علیل و رنجور ہے اور جس کا تن طبیبوں کا نیاز مند بنا ہوا ہے۔ وہ دیکھے گا کہ روحوں کو شفا بخشنے والا اور اخلاق کے بیماروں کو چشم زدن میں چنگا کر دینے والا طبیب خود بھی جسمانی آزار و آلام سے مستثنیٰ نہیں۔ زہر آپ کو دیا گیا، اور زہر کا اثر آپ پر ہوا تیر کے زخم آپ کے جسم پر لگے، دندان مبارک شہید ہوئے اور خون ڈھلا ڈھل اس جسدِ انور سے بہا۔ اور پھر بخار کی شدت اور کرب، جو ایسے صابر اور رضا بلا کو بھی متاثر کئے ہوئے تھی۔ کونسی رنجوری ہے جس کے لئے نسخہٴ شفا اس دار الشفا میں موجود نہیں؟

یتیمی کے داغ، ماں باپ کا غم

یتیمی کے داغ سے بڑھ کر اور کون داغ ہو سکتا ہے۔ اس وقت سے بڑھ کر بے کسی اور بے یارگی کا اور کونسا وقت ہوتا ہے؟ آج ساری دنیا کے بیکس بیچارے، یتیموں یسیروں کو خوشخبری ہو کہ جس نے ساری دنیا کے یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھا، وہ خود بھی یتیم ہی ہو کر دنیا میں آیا۔ اور یتیمی بھی کس غضب کی، عمر کے دس سال پر نہیں، پانچ سال پر نہیں، والد کی شکل سرے سے دیکھی ہی نہیں۔ اور باپ کی محبت کو ایک لمحہ کے لئے بھی جانا ہی نہیں۔ جب دنیا میں تشریف لائے تو باپ پہلے ہی واپس بلا لیئے گئے تھے۔ رہیں والدہ ماجدہ، سو وہ بھی پانچ سال سے زائد اپنے

آنکھوں کے تارے اور عالم کے آفتاب کا نظارہ نہ کر سکیں۔ یتیم کا اطلاق تو اس پر ہونے لگتا ہے جس کا صرف باپ زندہ نہ ہو۔ یہاں شروع سے بے پدری اور شعور پیدا ہوتے ہی بے مادری' ایک ساتھ یتیمی و یسیری۔

دنیا جہان کے یتیمو!

اپنے حال پر رونے اور کڑھنے کی جگہ خوش اور نازاں ہو کر تم کس کی صف میں کھڑے ہوئے ہو۔

طنز و تشنیع

طنز و تشنیع سے خوف کھانے اور بدنامی و رسوائی سے ڈرنے والو! ذرا اس نمونہ کو پیش نظر رکھو' جس کے جلو میں ملائکہ مقربین اور جبرئیل روح الامین کی نصرتیں تھیں' اس پر بھی اسے احد میں اور حنین میں چاہے وہ کسی مصلحت سے اور کتنی ہی عارضی طور پر ہو' دشمنانِ دین کے سامنے ناکام رکھا جاتا ہے' اور دشمنانِ حق کے مقابلہ میں اس کی مغلوبیت دکھائی جاتی ہے۔ راستی اور راست بازی کے دشمنوں نے ایسے موقع پر انتہائی دلخراش و دل شکن طنز و تمسخر کا کوئی دقیقہ اٹھا رکھا ہو گا۔ بے اولادی کا طعن کوئی معمولی طعن ہے۔ کسی فرزند نرینہ کے نہ باقی رہ جانے کا طنز کوئی آسانی سے برداشت ہو جانے والا طنز ہے۔ پھر صاحب کوثر کو یہ سب سننا پڑا یا نہیں۔ امت کے حق گوؤں اور حق پرستوں کے لیے حیات طیبہ کی کتاب کے ابواب کیا سرے سے بے معنی ہیں؟

خانہ داری کے مشکلات

بیوی کسی کی ایک ہوتی ہے تو اس کے پورے ادائے حقوق اور اس کے ساتھ ہمیشہ لطف و موافقت مشکل رہتا ہے' چہ جائیکہ جس کی ایک وقت میں دو نہیں تین نہیں' اکٹھی نو نو بیویاں ہوں۔ ان سب کے ساتھ یہ حسنِ معاشرت نباہ کرنا معمولی بشر کا کام تھا؟ عقل کے اندھے کہتے ہیں کہ یہ ایک صورت عیش پرستی کی تھی۔ خدائے واحد کی قسم! یہ صورت انتہائی مجاہدہ

اور نفس کشی کی تھی۔ بیویاں بھی جنت کی حوریں یا فرشتہ بنا کر نہیں بھیجی گئی تھیں۔ یہی انسانی اجسام ان کے تھے، یہی کھانے پینے کی خواہشیں اور یہی پہننے اوڑھنے کی ضرورتیں، یہی قلوب کے اندر رقابت کی چشمکیں باہم چلتیں، باتیں بڑھتیں اور ملال و تکدر حضورؐ کے قلب مبارک تک پہنچتا۔ کاشانہ مبارک میں جو بے سروسامانی تھی ظاہر ہے۔ صراحت کے ساتھ ان بیویوں کو علیحدگی کا اختیار دے دیا گیا۔ سب کی سب اس درجہ دالا و شیدا تھیں کہ کسی ایک نے بھی اس اختیار سے فائدہ اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ بیویوں بچوں کے جنجال میں پھنسے ہوئے امتی، کیا کوئی سبق نہیں لے سکتے؟

تہمت والزام کے صدمے

کسی باعزت شریف کی بے گناہ بیوی پر آج ذرا سا عیب لگا دیا جائے، دیکھئے میاں بیوی دونوں کی کیا حالت ہو کر رہتی ہے۔ نہ معلوم کتنے شوہروں نے ایسے موقعوں پر بیویوں کو تلوار کے وار یا بندوق کی گولی سے ختم کر دیا ہے اور خود بھی خودکشی کر لی ہے اور کتنی بیویاں کنوئیں میں پھاند پڑی ہیں یا کچھ کھا کر سو گئی ہیں۔ اب ذرا اس شریف شوہر کو دیکھئے جو دنیا میں شرافت، عصمت اور حیا کا پیکر بنا کر بھیجا گیا تھا، اور اس کی اس عزیز و محبوب بیوی کا خیال کیجئے جس کی نیچی نگاہوں کی بلائیں خود حیا پروری اور عصمت شعاری لیتی تھی، اور جس کے صدق و وفا کی گواہی صراحت کے ساتھ قیامت تک کے لئے خود کلام مجید کے صفحات نے دے دی۔ حوا کی بیٹیوں میں بجز مریمؑ صدیقہؓ کے اور کس کے نصیب میں یہ دولت آئی ہے۔ بے ہودہ لوگوں نے جب عائشہ صدیقہؓ سے متعلق اپنی زبانیں گندہ کی ہیں، تو اس طہارت و لطافت کے پتلے اور اس شرم و حیا، عصمت و وفا کی تصویر پر کیا کیا گزر رہی ہوگی؟ تلخ اور زہرہ گداز تجربہ بہرحال کرایا گیا۔ اور ہر زمانہ کے مومنین اور مومنات کیلئے تسکین و تسلی کا کتنا اہم اور کیسا بیش بہا سبق دے دیا گیا۔

زندگی کے حوادث میں جامع تعزیت و تسلی

غرض اجتماعی و انفرادی، قومی، معاشرتی، خانگی و شخصی، کوئی بھی ممکن پہلو انسانی

زندگی کا لیجئے، غم والم کی جتنی صورتیں انسان کو کسی شعبۂ حیات میں پیش آسکتی ہیں، انہیں فرض کیجئے۔ ہر درد کا درماں، ہر زخم کا مرہم، ہر حادثہ کے لئے تعزیت اگر ملے گی تو اسی دارالشفائے محمدی کے اندر۔ روحانیت کے دوسرے پہلوؤں اور صدق رسالت کے دوسرے دلائل سے قطع نظر محض اسی ایک جامعیت کے پہلو کو لیجئے۔ اس کی نظیر اگلوں اور پچھلوں میں، مشرق و مغرب میں شمال و جنوب میں کہاں ملے گی؟ ہر بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت، تسلی و دلدہی کو اسوہ مبارک ... د۔ کتنا سچ ہے کہنے والے کا قول، جو اس نے اپنے متعلق کہا کہ ..... "میں ق... ر ا بنیا کی آخری اینٹ ہوں"..... عمارت بے شبہ ہر طرح پر کامل و مکمل، آراستہ و پیراستہ، پہلے سے تیار تھی، لیکن اس آخری اینٹ کے بغیر یہ جامعیت اور یہ اکملیت کہاں تھی۔ رحمتیں اور بے شمار رحمتیں نازل ہوں اس پر جس کے وجود نے کامل کو اکمل، شریف کو اشرف، فاضل کو افضل، حسین کو احسن اور جمیل کو اجمل کے مرتبہ تک پہنچا کر، اُمت کے غریبوں اور ضعیفوں، دکھیاروں اور ناچاروں، بیماروں اور سوگواروں، غمزدوں اور ناداروں، سب کی تسکین کا سامان، رہتی دنیا تک کر دیا؟

عتابِ محبوبؐ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۙ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ
لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۭ اَمَّا
مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۭ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا
يَزَّكّٰى ۭ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاۗءَ
ذَكَرَهٗ ۘ

۳۰ : ۸۰ (پہلی بارہ آیات)

ترجمہ:

پیغمبر چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا، اس بات پر کہ ان کے پاس نابینا آیا ــ اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور ہی جاتا، یا نصیحت قبول کر لیتا، اور اس کو نصیحت کرنا فائدہ ہی پہنچاتا ــ سو جو شخص (دین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑ جاتے ہیں ــ درآنحالیکہ آپ پر کوئی الزام نہیں، اگر وہ نہ سنورے۔ اور جو شخص آپ کے پاس دوڑا ہوا آتا ہے اور وہ خشیت رکھتا ہے تو آپ اس سے بے اعتنائی برتتے ہیں ــ ہرگز ایسا نہ کیجئے ــ قرآن تو بس ایک نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے ــ

عتابِ محبُوب

صورتِ حال

صورت یہ ہوئی کہ ایک بار مکہ میں حضورؐ اپنی مجلس میں معروفِ تبلیغ تھے کہ قریش کے بڑے بڑے زور آور اور متکبر سردار' ابوجہل' شیبہ' امیہ وغیرہم آنکلے اور اس مجلس میں بیٹھ گئے۔ اسلام سے بڑھکر ظاہر ہے کہ حضورؐ کو کونسی شے عزیز ہوسکتی تھی؟ دن رات' اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' دھن تھی تو اسی کی' تڑپ تھی تو اسی کی۔ ایسا موقع مل جانا حضورؐ کے نقطۂ نظر سے غنیمت نہیں نعمت تھا۔ ایسے مواقع حاصل ہی کب ہوتے تھے؟ منکرینِ قریش' حضورؐ کی کوئی آواز اپنے کانوں تک آنے ہی کے کب روادار ہوتے تھے' جتنی سرگرمی' جس قدر انہماک' خیال میں آسکتا ہے' حضورؐ اس سب کے ساتھ انھیں کی طرف متوجہ تھے۔ خدا جانے کن کن آرزؤں کے ساتھ کہ ان میں سے ایک متنفس بھی ایمان قبول کرلے تو اس کے ساتھ بیسوں پچاسوں سیکڑوں اور مسلمان ہوجائیں۔

عین ایسے موقع پر ایک نابینا اور وجاہتِ دنیوی کے اعتبار سے ایک بالکل معمولی درجہ کے مسلمان حاضرِ خدمت ہوتے ہیں اور کچھ پوچھ پاچھ شروع کردیتے ہیں۔ غریب کو کیا خبر کہ یہاں کون کون بیٹھا ہوا ہے۔ سردارانِ قریش کی ذہنیت کا حال معلوم ہے۔ اپنے مرتبہ اپنی پوزیشن کے نشہ میں کس قدر چُور رہتے تھے۔ بدر میں مقابلہ پر جب انصار (شرفائے مدینہ) آئے تو یہ کہہ کر لڑنے سے انکار کردیا کہ تم ہمارے برابر کے نہیں ہو۔ چنانچہ نہیں لڑے، جب تک کہ مقابلہ میں خاندانِ قریش ہی کے مومنین صف آرا نہ ہوگئے۔ اسی بدر میں ابوجہل جب قتل ہونے لگا تو عین اس وقت اپنے قاتل سے رحم کی درخواست نہیں کرتا' بلکہ پوچھتا ہے کہ تم ہو کون؟ اور جب جواب میں ان کا انصاری ہونا سنتا ہے تو حسرت و یاس سے انہیں آخری

لفظوں پر دم توڑتا ہے کہ :

"کاش! میرا قاتل شرفائے مکہ میں سے کوئی ہوتا۔ افسوس کہ جان ایک کاشت کار کے ہاتھ سے جارہی ہے۔"

یہ تھی ذہنیت ان قریشی سرداروں کی۔ اس ذہنیت کے افراد پر جو اثر ان نابینا کے یک بیک آجانے اور (ان کے نقطۂ خیال سے) دخل در معقولات شروع کر دینے کا پڑا ہوگا، وہ ظاہر ہے۔ حضورؐ سے بڑھ کر ان لوگوں کے ایمان لے آنے پر حریص اور کون ہو سکتا تھا۔ ٹھیک اسی نسبت سے حضورؐ پر تنغص وانقباض کا اثر ہونا بھی بالکل قدرتی تھا۔

اب آیت پڑھئے اور مفہوم مقتضائے حال کی مناسبت سے پوری طرح ذہن نشین کرتے جائیے۔

عبس وتولىٰ ان جاءه الاعمىٰ

نبی اپنی مجلس خاص میں منقبض ہو گئے اور بے التفاتی برتی اس پر کہ ایک نابینا آوارد ہوئے۔ اعمیٰ کا لفظ کسی تحقیر یا تعریض کے لئے نہیں، بلکہ یہ لفظ لا کر گویا ان صحابیؓ کی طرف سے صفائی پیش کر دی گئی کہ ان بیچارے کی یہ مداخلت، قصداً اور دانستہ نہ تھی۔

تبلیغ کا اقتضائ

حضورؐ انور اس موقع پر اور ان حالات میں یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔ کوئی بھی مبلغ ایسے موقع پر ہوتا تو اور کیا کرتا؟ کیا ان بڑے بڑے سرداروں کے ایمان لانے کا موقع یوں ہاتھ سے نکلے جاتے دیکھنے پر خوش ہوتا؟

فروع کا سوال

پھر وہ صحابیؓ صاحب، زیادہ سے زیادہ پوچھنا کیا چاہتے تھے، خدانخواستہ انھیں توحید میں شک تھا؟ رسالت میں شبہ تھا؟ وجودِ آخرت میں تردد تھا؟ مومن تو بحمداللہ وہ تھے ہی۔ جو کچھ بھی پوچھتے، دین کے فروع ہی کی کوئی بات ہوتی، کہاں کسی کو دین کے اندر کوئی فرعی عمل بتانا اور کہاں کفار کے کسی رئیس یا چند رؤسا کو دائرہ اسلام میں لانا! دونوں کی اہمیت کا کوئی مقابلہ ہو سکتا تھا؟ چہ جائیکہ

جب وہ چند کافر چند سو کے لئے ذریعۂ ہدایت بن سکتے تھے؟

نبی سے بکستہ منبسط رکھنے والا کوئی دوسرا مبلغ ہوتا تو یہ وقت تو وہ تھا کہ بے اختیار جھنجھلا اٹھتا۔ حضورؐ خود بھی اگر اس گھڑی قولی یا فعلی، کوئی سختی یا تشدد برتتے، جب بھی فطرت بشری کے لحاظ سے بالکل حق بجانب ہوتا۔ نہیں، فطرت بشری ہی نہیں، فطرتِ نبوی کے بھی عین مطابق ہوتا۔ راہِ تبلیغ میں رکاوٹ دیکھتے، کون نبی ایسا تھا کہ اللہ ہی کے واسطے اللہ ہی کے دین کے واسطے جوش سے تمتما نہ اٹھتا؟ ـــــ لیکن یہاں کمالِ حلم سے یہ بھی تو نہ ہوا۔ اور معاملہ صرف عدم التفات اور چیں بہ جبیں پر ختم ہو کر رہا۔ اور وہ صاحب ٹھہرے آنکھوں سے معذور۔ انھوں نے دیکھا ہی نہیں، اس لئے انکی کچھ زیادہ دل شکنی بھی نہ ہونے پائی۔

غرض مبلغِ اعظمؐ نے جو بھی کیا، اس موقع پر کوئی بشر یہاں تک کہ پیمبر بھی اس سے زیادہ، اور اس کے سوا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اب ان کی سنئے جو بشر نہیں، خالقِ بشر ہیں، اور جن کے لئے انسانی غیب اور شہادت، دونوں ایک حکم میں ہیں، فرماتے ہیں، اور ان کا فرمانا بشری دماغ کی تشریح کے مطابق سمجھتے جائیے:

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ

اے پیغمبرؐ! آپ کو غیب کی کیا خبر؟ ممکن تھا کہ ہمارے علم غیب میں یہی مقدر ہوتا کہ وہ صحابیؓ آپ کی اس وقت کی توجہ والتفات سے پوری طرح نکھر جاتے۔ نکھرے ہوئے تو تھے ہی، اب پوری طرح سنور جاتے۔ کمالِ تزکیہ حاصل کر لیتے۔

أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ

یا یہی ہوتا کہ وہ جو خاص چیزیں آپ سے دریافت کرنے آئے تھے اسی میں آپ کی نصیحت پوری طرح کارگر ہو جاتی۔ اسی باب خاص میں انھیں پوری تشفی ہو جاتی۔

اجتہادِ نبویؐ صحیح یقیناً نہیں قرار پایا۔ لیکن کس معیار سے؟ کسی بشری، انسانی، طبعی، مخلوقی، یہاں تک کہ پیمبری معیار سے بھی نہیں! محض خدائی، الٰہی، فوق البشری، عالم الغیبی معیار سے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کا اجتہاد بجائے خود بالکل صحیح، مرض کی اہمیت یقیناً انہی کفار کی بڑھی ہوئی تھی لیکن مسئلہ کا دوسرا رخ بھی تو تھا۔ نظر ادھر کرنی چاہئے تھی۔ سردارانِ قریش کا مرض لاکھ اہم

سہی، یہ بھی بالکل درست کہ ہر طبیب، زکام کے مریض سے پہلے ہیضہ ہی کے مریض پہ توجہ کرے گا، لیکن پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ بدبخت طالب علاج تھے کب؟

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى

استغنیٰ سے۔ وہ اپنے کو مریض اور محتاج علاج سمجھ ہی کہاں رہے تھے؟ اب تو الٹی آپ سے نفرت اور وحشت کر رہے تھے۔ طلب حق سے بیزار تھے۔ آپ کے پاس سے ہٹنے اور بھاگنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اور آپ انھیں کی طرف لٹے جاتے تھے۔ حق تعالیٰ کی غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی۔ ایمان لائیں نہ لائیں، خود ہی بھگتیں گے۔

یہ بالکل درست کہ مبنیٰ و منشأ آپ کے اس عمل کا آپ کی غرض اصلاح و شفقت علی الخلق ہی تھی۔ لیکن اثنات تبلیغ کے ترتیب و وقوع کا اس درجہ اہتمام آپ کے ذمہ ہے کب؟ آپ کا کام صرف تبلیغ کر دینا ہے۔ وہ نہیں سنتے تو . . . .

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى

آپ کو کیا۔ نتائج و ثمرات تو تمامتر ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ وہ نہ مانیں آپ کی بلا سے۔ آپ پر ان کے نہ ماننے کا کیا الزام؟ اور آپ کیوں اس فکر میں پڑ گئے۔

اب رہا وہ دوسرا شخص جس سے آپ نے بے التفاتی برتی، اس کا مرض لاکھ ہلکا سہی اور اس پر مزورت توجہ اس حیثیت سے اور اسی نسبت سے، ہزار مؤخر۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى

لیکن یہ بھی تو خیال کیجئے کہ وہ طلب صادق کے ساتھ، امید شفا لے کر، اپنے کو مریض اور آپ کو طبیب سمجھ کر دوڑا ہوا آیا تھا۔ اس کے دل میں اعتراض نہیں، اللہ کا ڈر تھا۔ وہ نسخۂ شفا آپ سے مانگنے آیا تھا۔ کیا اب بھی وہ مستحق توجہ نہ تھا؟ اس کا حق راجح نہ تھا؟

خیر یہ واقعہ خاص تو گزر ہی چکا۔ آئندہ ایسا نہ ہونے پائے۔ خوب مستحضر رکھئے کہ:

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ

کلام مجید زبردستی کسی کے سر پر چپکنے کی چیز ہی نہیں، محض نصیحت کی کتاب ہے۔ جس کا جی چاہے اسے ہنسی خوشی قبول کرے، جو ادھر نہ آنا چاہے وہ آپ بھگتے گا۔

اس کے آگے بھی کچھ دور، کلام مجید ہی کے خصوصیات کا بیان چلا گیا ہے۔ لیکن جو سوال تھا، اس کا جواب ختم ہو چکا۔ ان توضیحات و تصریحات کے بعد نبی کریم صلعم کا طرزِ عمل بحمد اللہ بالکل شفاف بے غبار نظر آنے لگا، اور کم از کم اس باب میں ذہن کو کوئی الجھن باقی نہیں رہی۔

میلادی روایات

میلادی روایات

بعض پچھلے نمبروں میں بہ ذیل مراسلات، میلادی روایات کی صحت و عدم صحت پر کچھ گفتگو آچکی ہے۔ آج کی صحبت میں پھر اس پہ ایک نظر کرنا ہے۔

کلام مجید میں ذکر متعدد انبیاء کرام کا آتا ہے لیکن صرف چند انبیاء کرام اور ان کے متعلقین ہیں، جن کی پیدائش یا ولادت کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس مختصر فہرست میں سب سے پہلے نام حضرت آدم علیہ السلام کا ہے۔ آپ کی پیدائش خوارق عادات کا ایک مجموعہ تھی اور فطرت کے عام دستور کے بالکل خلاف ہوئی۔ اول تو آپ کو بغیر ماں اور بغیر باپ کے پیدا کیا گیا، پھر فرشتوں سے آپ کی تعظیم کرائی گئی اور جس مخلوق نے آپ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا وہ ہمیشہ کے لئے ملعون ہوگیا۔ آپ کو تمام اسماء کا علم کرا دیا گیا۔ آپ کی پیدائش سے قبل فرشتوں سے خاص طور پر گفتگو فرمائی گئی اور پیدائش کے بعد ہی فرشتوں کے علم کا آپ کے علم کے مقابلہ میں امتحان لیا گیا، جس میں آپ کو کامیابی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا سلسلہ واقعات عام انسانوں کی پیدائش کے قبل و بعد وجود میں لاتے رہنے کا دستور نہیں۔ زوج آدمؑ حضرت حواؑ کی پیدائش کے بابت کوئی تصریح کلام مجید میں وارد نہیں، لیکن اس قدر ہے کہ وخلق منها زوجها (اسی نفس واحد، یعنی آدمؑ سے اس کے زوج کو پیدا کیا) اور اکثر مفسرین مثلاً امام ابن جریر، حافظ ابن کثیر، قاضی بیضاوی وغیرہم نے قتادہؒ، سدیؒ و ابن عباسؓ کے حوالے دیکر یہ معنی لکھے ہے کہ آپ کی پیدائش حضرت آدمؑ کی پسلی سے ہوئی۔ یہ معنی بالکل صحیح ہوں یا نہ ہوں، لیکن اتنا اشارہ تو کلام مجید سے بھی ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش فطرت کے عام دستور سے ہٹ کر کسی اور طریق پر ہوئی تھی۔

حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کے سلسلے میں کلام مجید سے ثابت ہے کہ بشارت دینے فرشتے انسان کی

صورت میں مرئی ہو کر آئے، جنھیں آپ کی والدہ نے، جو نبی نہ تھیں، دیکھا، ان سے گفتگو کی، اور ان فرشتوں نے انھیں حضرت اسحٰقؑ کے علاوہ حضرت یعقوبؑ کی بھی بشارت دی اور ان کے دل کو تسلی اور ڈھارس دی۔

اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام کی ولادت پر، ان کی والدہ پر، باوجود ان کے نبی نہ ہونے کے، وحی نازل ہوئی۔ ان کے دل کو تسلی و تشفی دی گئی۔ حضرت موسٰی کی حفاظت کا ایک خاص طریقہ بتایا گیا۔ ان کے محفوظ رہنے اور آئندہ پیمبر بننے کا علم جو اب تک پردۂ غیب میں تھا، ان کی والدہ کو عطا کیا گیا۔ پھر سمندر میں ڈالے جانے کے بعد معجزانہ انداز سے آپ کی پرورش فرعون و اہل فرعون سے کرائی گئی، اور رضاعت پر آپ کی والدۂ ماجدہ ہی کو مقرر کرایا گیا۔ یہ ساری تصریحات کلام مجید ہی میں ہیں، احادیث میں اور زائد تفصیلات موجود ہیں۔ یہ سارے واقعات خوارق عادت ہیں یعنی فطرت کے عام دستور کے خلاف ہیں۔

حضرت یحیٰیؑ کی ولادت اس وقت ہوئی جب آپ کے والد ماجد اپنے کو بوجہ ضعیفی تولید کے ناقابل اور آپ کی والدہ کو عقیمہ سمجھ چکے تھے۔ پھر اس مبارک ولادت کی بشارت فرشتوں نے پکار پکار کر دی۔

اور حضرت عیسٰیؑ کی ولادت تو ایک مجموعۂ عجائب ہے۔ آپ کی والدۂ ماجدہ حضرت مریمؑ کا بغیر کسی مرد کے حاملہ ہو جانا، باوجود نبی نہ ہونے کے فرشتوں کا آپ سے گفتگو کرنا، اور اپنے بطن سے ایک نبی مرسل کے تولد ہونے کی بشارت ملنا، وضع حمل کے وقت ایک چشمہ کا جاری ہو جانا، تازہ پھلوں کا خود بخود آ کر گرنا، پھر حضرت مسیحؑ کا بچپن ہی میں بولنے لگنا، اور اپنی والدہ مکرمہ کی پاکدامنی کی شہادت دینا ـــــ ہر واقعہ بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ خود حضرت مریمؑ کے پاس اپنے بچپن میں بغیر کسی ظاہری ذریعہ کے کھانا پہنچ جانا قرآن ہی میں درج ہے اور احادیث میں خوارقِ عادات کے مزید جزئیات مل جاتے ہیں۔

بہرحال اللہ کے جتنے نیک اور برگزیدہ بندوں اور بندیوں کی پیدائش کا ذکر کلام مجید میں ہے، ان سب میں یہ امر مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی پیدائش کے وقت، یا قبل، یا بعد، کچھ خوارق عادت کا ظہور ضرور ہوا ہے یعنی ایسے واقعات برابر پیش آئے ہیں جنھیں انسان اپنے محدود تجربہ میں، فطرت کے

عام دستور کے خلاف پاتا اور سمجھتا ہے، خصوصاً ماؤں کو غیبی بشارتیں ملنا، تو حضرت مسیحؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت اسحٰقؑ تینوں کی ولادتوں کے متعلق اور فرشتوں کا مرئی ہو کر آنا حضرت مریمؑ اور حضرت سارہؑ دونوں کے متعلق (باوجود ان کے نبی نہ ہونے کے) ثابت ہے۔ پھر اگر رسولوں کے سردار اور پیمبروں کے سرتاج کی ولادت کی بشارتیں فرشتوں نے پکار پکار کر دی ہوں، اگر اس آفتاب کے طلوع پر عالمِ ملکوت میں غلغلۂ شادمانی و مسرت برپا ہوا ہو، اگر اس نورِ مجسّم کی والدہ ماجدہ کے لئے بعض انوارِ غیب مرئی ہو گئے ہوں، اگر اس خوش نصیب و قابلِ رشک خاتون کے شہود میں بعض لطائفِ ملکوت نے آئے گئے ہوں، تو کیا کسی مسلمان کو اس پر حیرت ہونی چاہئے؟

کہا جاتا ہے کہ صحیح حدیثوں میں ان عجائب و خوارق کا ذکر نہیں جو عموماً میلاد ناموں میں درج ہیں۔ حدیثوں میں ان واقعات کا ذکر تو کثرت سے ہے، اس سے کسی گروہ کو بھی انکار نہیں، بحث صرف یہ رہ جاتی ہے کہ آیا یہ احادیث صحیح و قابلِ استناد بھی ہیں یا ضعیف و موضوع؟ اس کے جواب کا حق عوام کو نہیں بلکہ صرف ماہرینِ فن کو ہے۔ قانون، طب، فلسفہ، ادب، دنیا کے ہر علم و فن کی طرح فنِ حدیث بھی ایک مخصوص فن ہے اور حدیثوں کا پرکھنا، صحیح کو ضعیف سے الگ کرنا صرف انہیں بزرگوں کا کام ہو سکتا ہے جنہوں نے مخصوص اس فن کی تحصیل و تکمیل میں اپنی عمریں صرف کی ہوں اور جن کا محدث و نقادِ حدیث ہونا اہلِ فن کو مسلم ہو۔

یہ سچ ہے کہ بعض محدثین نے ان میلادی روایات کی تضعیف کی ہے لیکن جن بزرگوں نے انھیں قبول کر کے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے اور ان سے استناد کیا ہے ان کا علم و فضل، ان کا تبحّر و دائرۂ نظر بھی کچھ کم قابلِ احترام نہیں۔ ایسی حالت میں ہم عامیوں کے لئے ان روایات سے یکسر انکار کر بیٹھنا کہاں تک زیبا ہے؟ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ دورِ متاخرین میں شاید محدثین کے سرتاج ہوئے ہیں۔ کتبِ میلاد کی تصنیف میں آپ کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے لیکن خود شاہ صاحبؒ نے جو فارسی میلاد نامہ تالیف فرمایا ہے اس میں ان روایات سے انکار نہیں بلکہ بعض کا اندراج موجود ہے۔

فرماتے ہیں:

شبِ ولادت آنحضرت صلعم درحرکت آمد کوشک کسریٰ تا آنکہ شنیدہ شد آواز وے وافتاد از آنجا چہاردہ کنگرہ و سرد آتش فارس و نمردہ بود پیش ازاں بہزار

سال وخشک شد چشمہ ساوہ۔

(سرور المحزون ص۳، مجتبائی دہلی)

ترجمہ:

آنحضرت صلعم کی شبِ ولادت کسریٰ کے محل میں لرزہ پڑا جس کی آواز سنی گئی اور اس کے چودہ کنگرے گر گئے اور آتش فارس جو ایک ہزار سال سے برابر روشن تھی، بجھ گئی اور چشمہ ساوہ خشک ہو گیا۔

یہ روایتیں عام طور سے میلاد ناموں میں بیان کی گئی ہیں اور شاہ صاحبؒ کا انہیں قبول کر لینا ہم عامیوں کے لئے کافی تشفی بخش ہو جانا چاہئے۔

آج سے ساڑھے تین سو سال قبل، ہندوستان کے ایک اور فاضل حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ بھی فنِ حدیث کے ایک ممتاز و مستند عالم گزرے ہیں۔ آپ کا ایک رسالہ عربی میں 'ماثبت بالسنۃ' کے نام کا ہے، جس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس رسالہ کے ص۳۲ سے لیکر ص۴۷ تک میلاد مبارک کے سلسلہ میں جو جو عجائب و خوارق عام میلاد ناموں میں مذکور ہیں، تقریباً سب کے سب درج ہیں۔ مثلاً قریش کا پہلے سے خشک سالی میں مبتلا ہونا اور آنحضرت صلعم کے قربِ ولادت کی برکت سے کھیتوں کا سرسبز ہو جانا، حضور کی والدۂ ماجدہ کو حمل کی گرانی نہ محسوس ہونا، ہر مہینے رؤیا میں بشارتیں ملتے رہنا، وضعِ حمل کے وقت نورانی پرندوں کا نظر آنا، فضا میں بیبیوں کا چاندی کے لوٹے لئے ہوئے دکھائی دینا، زمین کے مشرق و مغرب کے انتہائی سرے تک نظر کے سامنے آجانا "ایک علم کا مشرق میں، ایک علم کا مغرب میں اور ایک علم کا پشتِ کعبہ پر نصب ہونا، ایوانِ کسریٰ میں زلزلہ پڑنا اور چودہ ستونوں کا گر جانا آتشِ عجم کا ہزار سالہ روشنی کے بعد بجھ جانا وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر یہ کچھ نہیں کہ اس رسالہ میں رطب و یابس سب ہی کچھ جمع کر دیا گیا ہے بلکہ عجائب و خوارق میلاد کی ابتدا میں محقق مصنف نے تصریح کر دی ہے کہ اس میں صرف وہی اخبار درج کئے گئے ہیں جو روایات احادیث کے مسلّم و متعارف طریقوں سے صحیح ثابت ہو چکے ہیں ـــــ واوردنا من الاخبار ما ورد وصح من الطریق المتعارف الروایۃ الاحادیث ـــــ (ص۳۷ نولکشوری)

اور صرف اسی رسالہ میں نہیں بلکہ سیرتِ نبویؐ پر مدارج النبوۃ کے نام سے حضرت شیخؒ کی جو مشہور

کتاب فارسی میں ہزار ڈیڑھ ہزار صفحے کی ضخامت کی ہے، اس میں بھی ان واقعات کو اور زیادہ تفصیل کے ساتھ دہرایا ہے۔ (جلد دوم ص۱۵ تا ص۲۲ مطبوعہ فخر المطابع ۱۲۷۱ھ)

حضرت شیخ کا ان روایات کو نقل کرنا اور ان کی تصحیح و توثیق کرنا کسی عامی کا نقل کرنا نہیں۔

ان دونوں بزرگوں سے بھی بڑھ کر شہادت قاضی عیاض مالکیؒ کی ہے جو پانچویں اور چھٹی صدی کے ایک نامور محدث اور صحیح مسلم کے مشہور شارح گزرے ہیں اور فن حدیث میں ان کا یہ مرتبہ ہے کہ بخاری و مسلم کے مشہور شارحین، امام نووی، علامہ ابن حجرؒ وغیرہ سب ان سے استناد کرتے ہیں، ان کی کتاب "الشفا فی تعریف حقوق المصطفٰے" کی بابت صاحب کشف الظنون کہتے ہیں:

"وھو کتاب جلیل عظیم النفع کثیر البرکت، لم یؤلف مثلہ فی الاسلام"

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ:

"ایں کتاب از عجائب کتب مصنفہ ایں باب است و خیلے مقبول افتادہ ــــــ و در حق آں کتاب علماء و شعراء اطالت مدح و ثنا نمودہ اند۔"

(بستان المحدثین ص۱۳۰، ص۱۳۱ مطبع محمدی لاہور)

اس کتاب جلیل کی جلد اول کی "قسم رابع" کے آخر میں ایک مستقل فصل "آیاتِ وقتِ ولادتِ مبارک" پر ہے۔ اس کے الفاظ ذیل ملاحظہ ہوں:

ومن ذٰلك ما ظہر من الآیات عند مولدہ، وما حکتہ اُمّہ ومن حضرہ من العجائب وکونہ رافعاً راسہ عند ما وضعتہ شاخصاً ببصرہ الی السماء وما رأتہ من النور الذی خرج معہ عند ولادتہ وما راتہ اذ ذاك ام عثمان ابن ابی العاص من تدلی النجوم وظہور النور عند ولادتہ حتی ما تنظر الا النور ۔۔۔۔۔ وما جری من العجائب لیلۃ مولدہ صلعم من ارتجاج ایوان کسریٰ وسقوط شرفاتہ وغیض بحیرہ طبریہ وخمود نار فارس وکان لہا الف عام لم تخمد

اور اسی طرح کے معجزات میں وہ آیات و عجائب بھی ہیں جو آپ کی ولادت کے وقت ظاہر ہوئیں اور جنہیں آپ کی والدہ نے اور ان لوگوں نے بیان کیا جو وہاں موجود تھے۔ اور وہ یہ ہیں کہ جب آپ دنیا میں ظاہر ہوئے تو آپ اپنا سر (گویا دعا کے لئے) بلند کئے ہوئے تھے اور آسمان کی طرف نظر فرما رہے تھے۔ نیز وہ امر جسے عثمان بن ابو العاص کی والدہ نے دیکھا تھا کہ آپ کی ولادت کے وقت ستارے جھک کر آپ سے قریب ہو گئے تھے اور آپ سے ایک ایسا نور عظیم ظاہر ہوا کہ ان کو کچھ نظر نہیں آتا تھا بجز اس نور کے ..... اور جو عجائب آپ کی شب ولادت میں ظاہر ہوئے مثلاً ایوانِ کسریٰ کا زلزلہ اور اس کے ستونوں کا گر پڑنا' اور بحیرہ طبریہ کا خشک ہو جانا اور آتش مجم کا جو ہزار سال سے روشن تھی' بجھ جانا۔

—— یہ شہادتیں ان بزرگوں کی تھیں جو حدیث وسنت کی پرکھ رکھنے والے اور فنِ حدیث کے جاننے والے تھے۔ انھوں نے ان روایات کو رد نہیں کیا بلکہ قبول کر کے اپنے صفحات میں جگہ دی۔ باقی جن محدثین کرام نے اول بار ان روایات کو شائع کیا اور اپنے مجموعۂ تالیفات میں جگہ دی یعنی بیہقی وحاکم' ابونعیم اور طبرانی وغیرہم، ان میں کوئی بھی کذب و غلط بیانی کے ساتھ متہم نہیں۔ صرف اتنا ہے کہ ان بزرگوں کا معیار روایت اس قدر بلند نہیں جتنا بخاریؒ و مسلمؒ وغیرہ کا تھا۔ یہ ہرگز مقصد نہیں کہ ان روایات کو جزوِ دین بنا لیا جائے اور ان کے رد و قبول کو کفر و اسلام کا معیار قرار دے دیا جائے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی زیادتی ہے کہ ان روایات کو سرے سے ناقابل قبول سمجھ کر ان سے یکسر انکار کر دیا جائے اور اس انکار کو اپنی تحقیق و روشن خیالی کی دستاویز قرار دیا جائے۔

ناک کا داغ

اے سرورِ دیں ! نُور ہے یکسر تری سیرت
اقدار کو کرتی ہے منوّر، تری سیرت
یا خیر کا معمورۂ پُر نور و معنبر
یا حسن کا مّواج سمندر تری سیرت
ہر رہ پہ مرا ہاتھ لئے ہاتھ میں اپنے
چلتی ہے مرے ساتھ برابر تری سیرت

——— حفیظ تائب

ناک کا داغ

نظامِ عالم کو قائم کیئے ہوئے بے شمار مدت گزر چکی ہے، دنیا اپنی انھیں نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کے ساتھ ایک بے حساب زمانہ سے آباد ہے، بڑی بڑی سلطنتوں کی بنیادیں پڑ چکی ہیں، نامی گرامی حکما پیدا ہو چکے ہیں، نامور کشور کشا گزر چکے ہیں، یہ سب کچھ ہے لیکن "علم" اور "تمدن" کا جو مفہوم آج سمجھا جا رہا ہے اس سے انسانی دماغ ابھی تک نا آشنا ہے۔ دنیا مختلف قوموں میں بٹی ہوئی ہے اور زمین مختلف اقلیموں میں بنٹی ہوئی ہے۔ ہر قوم دوسری سے بیگانہ، ہر ملک دوسرے سے اجنبی۔ آمد و رفت کے وسائل محدود، رسل و رسائل کے ذرائع دشوار، بین الاقوامی تعلقات بمنزلۂ صفر۔ لکھے پڑھے ہوؤں کی تعداد ہر ملک میں قلیل۔ کتابوں کی یہ فراوانی جو آج ہے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ گویا ہر ملک دوسرے ملکوں سے بے نیاز و بے تعلق، بجائے خود ایک مستقل عالم تھا۔ اسی لئے قدرتاً ہر ملک کے لئے ایک جداگانہ ہادی اور ہر قوم کے لئے ایک علیحدہ داعی

لیکن اب محاسب قدرت کے اندازہ میں وہ وقت آجاتا ہے جب ہر ملک کے ڈانڈے دوسرے سے مل کر رہیں گے، ہر قوم دوسری قوم سے تعلقات پیدا کرے گی، بیگانگی و بے تعلقی کی جگہ ایک سخت قسم کی دوستی یا دشمنی لے گی۔ کلوں کی ایجاد دور دراز سفر کو آسان کر دے گی۔ آلات کی مدد سے مشرق کی خبر، دم کی دم میں مغرب تک پہنچ جائے گی۔ چھاپہ کی کلیں نقوش کاغذی کے خزانے اگلنے لگیں گی اور کتابوں کے لکھنے والوں کی تعداد شاید پڑھنے والوں سے بھی بڑھ کر رہے گی۔

محاسبِ فطرت کا اندازہ

محاسب فطرت کے اندازہ میں جب کائنات اپنی عمر کی اس منزل تک پہنچ جاتی ہے جب دنیا

اپنی پختگی و تکمیل کا یہ درجہ طے کر لیتی ہے۔ جب یہ گھڑی آجاتی ہے تو اُس ملک میں جو اور سب ملکوں سے زیادہ بے علم اور اُجڈ تھا' اُس سرزمین پر جہاں علم و حکمت' تمدن و شائستگی کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا' اس فضا میں جس نے نہ کوئی ارسطو پیدا کیا تھا نہ کوئی جالینوس۔ نہ کوئی ہومر پیدا کیا تھا نہ کوئی کالی داس امیوں کے خاندان میں' ان پڑھوں کے گھرانے میں' ایک یتیم امّی اٹھا کھڑا کیا کہ اپنے ملک و قوم ہی کو نہیں بلکہ ساری انسانی آبادی کو اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بُلا' ساری دنیا کے بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھا' تارے بہت سے نکل چکے' شبِ انسانیت بسر ہونے کو آئی' اب تو مطلع کائنات پر آفتاب بن کر طلوع ہو' عامی و عالم' جاہل و حکیم' گورے اور کالے' مشرقی اور مغربی' نادان و دانا' سب کے ظلمت کدوں کو اپنی نورانیت کے پرتو سے روشن کر دے' عصائے موسیٰؑ' دمِ عیسیٰؑ' تختِ سلیمانؑ' نارِ ابراہیمؑ' حسنِ یوسفؑ وغیرہ کے سارے معجزات جو مخصوص ملکوں اور مخصوص قوموں کے مقابلہ میں پیش کئے جاتے تھے' ختم ہو چکے' اب زمانہ نئی کروٹ لے رہا ہے' تیرے جلو میں وہ معجزات ہوں گے جو آفتاب سے بڑھکر روشن ہوں گے۔ تو اُمّی ہے اور دنیا اب کاغذی نقوش پر جان دے گی۔ تو ان پڑھ ہے اور دنیا اب صرف سکولوں اور کالجوں' یونیورسٹیوں اور اکاڈمیوں کی ہوگی۔ تو خط نہیں لکھ سکتا اور دنیا میں اب پرستش صرف ڈگریوں اور ڈپلوموں' امتحانوں اور کتب خانوں کی ہوگی' لیکن ہماری قدرتوں کا اعجاز اور ہماری کارفرمائیوں کا تماشہ دیکھنا کہ یہی قلم اور یہی دوات[1] یہی کاغذ اور یہی سیاہی' یہی علوم اور یہی فنون' نٓ والقلم وما یسطرون — یہی کتب خانے اور یہی چھاپہ خانے' یہی کتابیں اور

---

[1] نٓ کے معنی ہر مفسر نے اپنے مذاق کے موافق لکھے ہیں لیکن لغت میں اس کے ایک معنی دوات کے ہیں اور یہی ابن عباسؓ' حسنؒ و قتادہؒ سے بھی مروی ہیں۔

النون الدواۃ وھی فسر قولہ عزوجل نٓ والقلم عن الحسن وقتادہ (تاج العروس)

عن ابن عباس قال ان اللہ خلق النون وھی الدواۃ (ابن جریر)

عن الحسن فی قولہ نٓ قال وھو الدواۃ (ہ) عن قتادہ قال النون الدواۃ

بغوی نے ضحاک کی جانب بھی یہی معنی منسوب کئے ہیں' بیضاوی' بغوی' نیشاپوری' سب نے ایک ہی معنی دوات لکھے ہیں اور خازن نے ایک شعر بھی سند میں نقل کیا ہے۔

کتبے، یہی مقالات اور یہی تحقیقات، یہی قلم اور دوات کی پیدا کی ہوئی ساری مخلوقات تیرے حق میں گواہ ہو کر رہیں گی۔ تیری ہی صداقت کا کلمہ پڑھیں گی، تیری ہی بزرگی و برتری کے محضر پر مہر تصدیق ثبت کریں گی۔ بدنصیب ابوجہل اور کور بخت ابولہب آج تجھے رد کر رہے ہیں تو اپنی بے بصری کی بنا پر معذور ہیں۔ کل ہی وہ دن آتا ہے جب انہیں کی ذریات جن لوگوں کو دانائی و فرزانگی کا امام تسلیم کرے گی، حکمت و دانش کا پیشوا تسلیم کرے گی۔ خود وہی زبان قال اور زبان حال دونوں سے مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ سے تیری گواہی دیں گے اور بول اٹھیں گے کہ تو اپنے پروردگار کے فضل و کرم سے ممنون اور دیوانہ نہیں، بلکہ خبطی اور دیوانے وہ ہیں جو اپنی جہالت سے تجھے جھٹلا رہے ہیں۔ عقل کے اندھے ہیں جو اپنی نادانیوں سے تیری نبوت میں شک کر رہے ہیں۔ دنیا جتنی آگے بڑھے گی عقل و حکمت کو جتنی ترقی ہوتی جائے گی، تیرے لائے ہوئے دین کا چہرہ روشن سے روشن تر ہو جائے گا، تیری عقل و فرزانگی کا آوازہ بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا۔ رازی و غزالی، طوسی و فارابی، ابن رشد و ابن سینا، تیری ہی حلقہ بگوشی پر فخر کریں گے۔ غزنوی و غوری، ترک و سلجوق، مصطفےٰ کمال و امان اللہ کو تیری ہی غلامی پر ناز ہوگا۔

زمانہ بدل جائے گا۔ اہل زمانہ کی طبیعتیں بدل جائیں گی۔ مشرق کی بساط الٹ کر مغرب کے ٹھاٹھ جم جائیں گے۔ روحانیت کی جگہ مادیت کا سکہ چلنے لگے گا۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن تیری محنت و کوشش کا صلہ غیر محدود ہے۔ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ـــ تیری تبلیغ رسالت کا اجر کبھی ختم ہونے والا نہیں، تو نے اپنی اصلاحات سے دنیا میں جو انقلاب برپا کر دیا ہے اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہی ہوتا جائے گا۔ تیرے غلاموں کے ذخیرۂ علم سے خوشہ چینی کر کر کے اہل مغرب بڑے بڑے نظامات فلسفہ تیار کریں گے، تیری منقبت نگاری کار لائل اور گوئٹے اپنے لئے باعث شرف سمجھیں گے۔ تیرا ہلکا پرتو پڑ جانے سے ٹالسٹائے اور گاندھی، ذرہ سے آفتاب بن جائیں گے۔ تیری عظمت کا اعتراف آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں کریں گی۔ تیرے منہ سے نکلے ہوئے کلموں کے زندہ و محفوظ رکھنے کے لئے ہالینڈ اور جرمنی کے بڑے بڑے دارالاشاعت وقف رہیں گے۔ تیرا نام ہر روز پانچ پانچ مرتبہ برلن، پیرس اور لندن کے بلند میناروں سے پکارا جائے گا۔ تیرے پرستاروں کی عبارت و کلام کی تشریح و تحشی کو براؤن اور نکلسن اپنے لئے سرمایۂ ناز سمجھیں گے۔ جو تیرے دین کے منکر ہوں گے، جو تیرے نام سے دشمنی رکھیں گے

خود انہیں کے قلم اور انہیں کی دوات، انہیں کے کاغذ اور انہیں کی سیاہی، انہیں کی عقل اور انہیں کے دماغ کو ہم تیری عظمت کے اعتراف، تیری دانائی کی شہادت، تیری کامیابی کی گواہی کے لئے وقف رکھیں گے۔

مناقب کی جامعیت

تو آج اُمی ہے، بیکس ہے، یتیم ہے اور ظاہر بینوں کی نگاہ میں بے وقعت و بے اثر۔ تیرا ابدی و دائمی معجزہ یہ ہے کہ علوم و فنون ہی تیری عقل و دانائی پر گواہ ہوتے جائیں گے اور اہل علم و ارباب فن ہی کا گروہ تیری کامیابی پر ایک دلیل ناطق ہوتا جائے گا، لیکن علوم و فنون کے دفتر یہیں تک پہنچ کر خاموش نہ ہو جائیں گے بلکہ تیری عقل و دانش، تیرے اثر و کامیابی سے گزر کر جب تیرے اخلاق کی بلندی، تیری زندگی کی پاکی و پاکیزگی، تیری سیرت کی عظمت و بزرگی کا تذکرہ آئے گا تو علم و فن کے دفتروں کی خاموش فَــاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ـــــ زبان ایک بار پھر ناطق ہو جائے گی اور تاریخ، تیرے آفتاب جمال کی نورانیت کے سامنے کسی بزرگ، کسی حکیم، کسی فاتح، کسی رشی، کسی مصلح، کسی نبی کی روشنی کو نہ پیش کر سکے گی۔ تاریخ اپنی فہرست مشاہیر (ہیروز) کو اوّل سے آخر تک دہرا جائے گی، اپنے اسماء الرجال کو ایک ایک کر کے سنا جائے گی لیکن زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر موقع پر اخلاق کی اس بلندی، ظرف کی اس وسعت، قلب کی اس فراخی اور مناقب کی اس جامعیت کی کسی دوسری مثال کے پیش کرنے سے عاجز رہ جائے گی۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے ماہرین نفسیات کی تحقیقات سے کہ نفس بشری تین اجزاء سے مرکب ہے۔

۱۔ عقل یا وقوف

۲۔ جذبات و احساسات

۳۔ ارادہ یا سعی عمل

ساتویں صدی کے ایک امی کی لائی ہوئی کتاب کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے تین مختصر و جامع فقروں میں دنیا کے مصلح اعظمؐ کی ساری زندگی کا عطر کھینچ دیا، اور حیرت انگیز اعجاز، بلاغت و جامعیت

کے ساتھ یہ تینوں حقیقتیں روشن کر دیں کہ:

(۱) نہ تو ان پیغمبرؐ کی عقل میں کسی طرح کا خلل اور دماغ میں کسی طرح کا فتور ہے بلکہ ان پر تو عقل و دماغ کے پیدا کرنے والے کا خاص فضل ہے۔ یعنی ان کی عقل تو مرتبۂ کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ ان کی عقل کے مرتبہ شناس ہونے کے لئے تو خود بھی بہت عاقل ہونے کی ضرورت ہے (مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ)

(۲) اور نہ یہ ارادہ و ہمت میں ضعیف ہیں۔ یہ مخالفتوں کے ہجوم سے گھبرانے والے نہیں۔ یہ اپنے کام میں بدستور لگے رہیں گے اور ان کی اسی قوتِ ارادی کے جو عملی نتائج و ثمرات نکلیں گے، وہ جلد کیا معنی دیر میں بھی ختم ہونے والے نہیں، وہ غیر محدود اور غیر منقطع ہیں (وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ)

(۳) پھر اپنے جذبات کی پاکی و پاکیزگی، اور اپنے احساسات کی بلندی و برتری کے لحاظ سے بھی تاریخ کائنات میں اگر کوئی ہستی بزرگ و عظیم کہی جانے کی حقدار ہے تو یہی ہے (وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ)

دنیا میں اب تک جتنے مصلح اور بزرگ پیدا ہوتے ہیں سب نے اسی سہ گانہ نفسی زندگی کی کسی ایک ہی صنف یا شاخ تک اپنی اصلاحوں کا دائرہ محدود رکھا ہے۔ کوئی وجود باری پر بہتر سے بہتر عقلی دلائل قائم کر گئے، معرفتِ الٰہی کے دقیق سے دقیق اسرار کھول گئے، رموز الٰہیات کی بہترین شرحیں لکھ گئے، کوئی ایسے آئے جو اپنے کلام کی شیرینی، زندگی کی سادگی اور پیام کی تاثیر سے دلوں کو موم کر گئے، بزمِ کائنات کے جذبات کو بے خود و بے قرار کر گئے، محفلِ گیتی کے احساسات سوز و گداز سے گرما گئے۔ اور کوئی ایسے بھی گزرے جنہوں نے اپنی ہمتوں کا ہدف بجائے دل و دماغ کے جسموں کو رکھا۔ اپنی زبردست قوتِ ارادی کی فوجوں کے ساتھ باطل کو ہر معرکہ میں شکست دی، اور جو اپنی بے پناہ قوتِ عمل کی شمشیر زنی کا نشان رزم گاہِ عالم کے چپہ چپہ پر ثبت کر گئے، لیکن وہ بے نظیر ہستی جو معرکۂ بدر میں سپہ سالار بھی ہو اور غارِ حرا میں خلوت نشین بھی، جو خدیجہؓ کا محبوب دلربا بھی ہو اور بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ کر صبر کرنے والا بھی، جو ایک کامیاب و معاملہ فہم تاجر بھی ہو اور ساری ساری رات عبادت کے لئے کھڑے ہو کر کاٹ دینے والا بھی، جو ناصح بھی ہو اور زندہ دل بھی، جو فقر و توکل کا بھی بوریہ نشین

ہو اور آئینِ جہانبانی کا علم بھی، جو علم و حکمت کا درس بھی دیتا ہو اور عشق و محبت کے گُر بھی سکھاتا ہو، جو ایک ہی وقت میں عقل و فہم کی درس گاہ کا استاد بھی ہو، جذبات کے چمن کا سب سے زیادہ لطیف شاداب اور سدا بہار پھول بھی ہو اور سعی و ارادہ کے میدان میں سب کا سردار بھی ہو، ایسی جامع اور لاشریک لہٗ ہستی تو صرف اسی معلم اعظم کی ہوئی ہے جس کی تصدیق کسی وقتی معجزہ اور ہنگامی کرامت پر منحصر نہیں بلکہ جس کی سچائی پر (نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ) دوات اور قلم، اور ان کے لکھے ہوئے دفتر علوم و فنون کی خاموش زبانیں ہمیشہ کیلئے گواہ ناطق رہیں گی۔

آج کا ماہرِ نفسیات اپنی محدود بشری معلومات کے لحاظ سے کہہ سکتا ہے کہ ترتیب بیان میں جذبات کے ذکر کو، ارادہ کے ذکر پر مقدم ہونا چاہئے تھا، لیکن اس بے چارے کو اس کی خبر نہیں کہ سیرت کی بلندی کے اصلی امتحان کا وقت تو ہر قسم کی عملی کامیابیوں کے حصول کے بعد ہی ہو سکتا ہے نہ کہ ان کے قبل۔ اس لئے انتہائی عملی کامیابیوں کا ذکر، سیرت کی بزرگی پر مقدم ہونا لازمی تھا۔ نفسیات کی عام درسی کتابوں میں لکھی ہوئی ترتیب میں اس بظاہر خفیف اصلاح کے ذریعہ سے کتاب مبین نے یہ پورا مفہوم واضح کر دیا کہ:

"اے پیغمبر!

ابھی تو تم کمزوری اور مغلوبی، بے کسی اور بے بسی کی حالت میں ہو۔ ابھی یہ نادان اور بدنصیب تمہارے اوپر مضحکہ کر رہے ہیں، لیکن عنقریب وہ دن آ رہا ہے جب تمہارے کمالاتِ عقلی کا انہیں اعتراف کرنا پڑے گا اور تمہاری تبلیغ کی عملی کامیابی کی یہ نوبت ہو گی کہ بڑے سے بڑے خزانوں کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہوں گی۔ بڑی سے بڑی فوجوں کی سرداری تمہیں حاصل ہو گی۔ بڑی سے بڑی قوت و طاقت کے تم مالک ہو گے۔ اس وقت تمہارے خلقِ عظیم کے جوہر چمکیں گے۔ اس وقت یہ نظر آئے گا کہ آج کی فروتنی و حلم، خاکساری و بُردباری، نرمی و رحمدلی، مغلوبیت کی مجبوری سے نہیں بلکہ تمہاری سرشتِ ملکوتی اور فطرتِ لطیف میں داخل ہے اور تمہاری سیرت کی بلندی و برتری کا پورا امتحان ان عملی کامیابیوں اور فیروزمندیوں کی معراج پر پہنچ کر ہو گا!"

بشارت کا وقت

یہ بشارتیں اس وقت نازل ہوتی ہیں جب حق چاروں طرف سے باطل کے زغہ میں گھرا ہوا ہے[1]۔ جب مکہ کا ایک پاک نسب یتیم، اپنے گنتی کے چند رفیقوں کو چھوڑ کر، مکہ اور گرد و جوار کی ساری آبادی کے خلاف اپنی بے چارگی اور بے بسی کو پوری طرح محسوس کر رہا ہے، جب چشم ظاہر کے سامنے کوئی ایک علامت بھی اس کی تائید و موافقت میں موجود نہیں، اس لئے معاً بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ آج تو ان پیشین گوئیوں کو کون تسلیم کرے گا، آج تو خود تمہارا ہی دل سارے ظاہری اسباب کامیابی سے مایوس ہو چکا ہے — فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ — لیکن عنقریب تمہیں بھی نظر آجائے گا اور انھیں بھی تم دیکھ لوگے، اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ واقعۃً نادان اور لا یعقل اور سر پھرا ہوا کون ہے؟ آج یہ اپنے عقل و فہم کے غرہ میں تمہیں نادان سمجھ رہے ہیں — اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ — لیکن کل ان نادانوں کو بھی نظر آجائے گا کہ بھٹکا ہوا کون ہے اور راہِ راست پر کون ہے؟ کس کا دماغ اوہام و خیالاتِ فاسدہ میں پھنسا ہوا ہے اور سر رشتۂ حقیقت کس کے ہاتھ میں ہے؟ کائنات کا پروردگار خود ہی اس کا فیصلہ کر کے رہے گا، قیامت ہی کو نہیں، اس مادّی و عنصری دنیا میں بھی[2]۔

یہ فیصلہ عنقریب ہو کر رہے گا، نہ ہو کہ اسے دور سمجھ کر اسے ہمیشہ، اور حالاتِ مخالف کے

---

[1] محققین کی تحقیق میں سورۂ اقراء کے بعد سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی ہے۔ عن جابر بن زید قال اول ما انزل اللّٰہ تعالیٰ من القرآن بمکۃ اقرا باسم ربک ثم ن والقلم — (اتقان، سیوطیؒ، نوع سابع ص۵۶ مطبوعہ کلکتہ)

[2] سو قریب ہے کہ تو بھی دیکھ لے گا اور یہ بھی دیکھ لیں گے، جس وقت تیرے نیک خُلقوں کی کشش اور ہدایت کی نشانیاں دنیا میں ان کو راہ پہ لائیں گی۔ تیرا کمال ان کی نظروں کے سامنے ظاہر اور جلوہ گر ہوگا اور موت کے بعد اچھی طرح دیکھ لیں گے۔

(شاہ عبد العزیز دہلویؒ)

ہجوم کو دیکھ کر کہیں تم ان نالائق جھٹلانے والوں کے کہے سُنے میں آجاؤ — فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ — اور نہ ہو کہ ان باطل پرستوں کی مروت یا صلح جوئی اور مصالحت پسندی کے تقاضہ سے اپنے فریضۂ حق گوئی میں کچھ کمی آنے دو۔ یہ لوگ تو دل سے چاہتے ہی یہ ہیں کہ اِدھر تم اپنے فرائضِ تبلیغ و رسالت میں نرم پڑو اور اُدھر وہ اپنی مشقِ ستم میں نرمی اختیار کرلیں۔ بلا لحاظ عواقب، بلا خیال نتائج، دعوتِ حق و تبلیغ رسالت میں لگے رہو۔ یہ تمہیں ضدی کہیں، جنگجو کہیں، غیر مصلحت اندیش کہیں، جو چاہیں کہیں، ان کی مروّت و خاطر میں خود نرم پڑ جانے کا خیال تک دل میں نہ لانا۔

ہر نور کے مقابلہ میں ظلمت، ہر ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت، ہر راستی کے مقابلہ میں کجی — فطرت کا دستور شروع سے چلا آرہا ہے، لطافت و پاکیزگی کے اس سرچشمہ، نیکی و خلوص کے اس سمندر، خوبی و محبوبی کے اس آفتاب کے مقابلہ میں لازمی تھا کہ دوسری طرف شرارت و نفاق، گندگی اور پلیدی، زشتی و خباثت کا ڈھیر بھی اسی درجہ کا ہو۔ اسی لئے فوراً ہی ارشاد ہوتا ہے کہ کس کے ساتھ مصالحت کروگے؟ کس کی جانب اتحادِ عمل کا ہاتھ بڑھاؤگے؟ کیا ایسوں کے ساتھ جن کے یہ خصوصیات ہوں؟ کیا ان کی طرف جن کے یہ اوصاف ہیں؟ جھوٹے، لپاڑیے، بات — وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ — بات پر بے ضرورت قسمیں کھانیوالے ذلیل و خوار، جنہیں اپنی عزتِ نفس کا ذرا خیال نہیں، عیب لگانے والے، طعن کرنیوالے، اِدھر سے اُدھر جاجاکر لگائی بجھائی کرنے والے، نیک کاموں میں روڑے اٹکانے والے، اپنی عقل کے غرہ پر اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کو توڑنے والے، گناہوں کی گندگی میں لتھڑے رہنے والے، جھگڑے بکھیڑے کرنے والے، اور پھر جس قوم و طبقہ میں شامل نہیں اس کی جانب اپنی نسبت کرنیوالے

المستلحق فی قوم لیس منھم (قاموس) الزائد فی القوم ولیس منھم (راغب) — المنتسب الی قوم ھو معلق بھم لا منھم (ایضاً) فی کلام العرب الملصق بالقوم ولیس منھم (ابن جریر) — حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن مسیبؒ سے بھی یہی معنی مروی ہیں۔

اور یہ ساری اکڑ کیوں؟ اس نشے کہ اپنے مال اور اولاد پر فخر ہے۔ اپنی جائداد اور جتھے پہ ناز ہے!

اسوۂ رسولؐ

رسولؐ آج چشم ظاہر سے مستور ہیں' لیکن "اسوۂ رسولؐ" مستور نہیں۔ وہ قدم جن پر پیشانیوں کا رگڑنا ہمارے لئے اوجِ سعادت تھا' آج ہماری نظروں سے اوجھل ہیں لیکن "نقشِ قدم" موجود ہیں ــــ صاحبِ خلقِ عظیم آج "رفیقِ اعلیٰ" کی رفاقت میں ہے لیکن "خلقِ عظیم" کی امانت انسانوں کے سینوں اور کتب خانوں کے سفینوں میں آج بھی محفوظ ہے۔ پیامبر کا پیام زندہ ہے' کام زندہ ہے' نام زندہ ہے۔ اور آج خاک کا ہر پتلا اپنے ظرف اور حوصلہ کے مطابق اس گنجِ نور سے کسبِ فیض کر سکتا ہے' ٹھیک اسی طرح باطل پرستی کی بھی راہ آج بھی بند نہیں' جس طرح صاحبِ "خلقِ عظیم" کی علوی نسبت زندہ اور قائم ہے' اسی طرح "حلافِ مہین" کا سفلی سلسلہ بھی منقطع نہیں ہوا ہے۔ بے ضرورت حلف نامے شائع کرنے والے' غیر اللہ کی قسمیں کھانے والے' اسے کمال انشاپردازی کا نمونہ سمجھ کر اس پر فخر کرنے والے' اپنے فوری مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ہاتھوں اپنی عزت و شرافتِ ظرف کا خون کر ڈالنے والے بیگانوں کے سامنے' اپنوں کی مخبری و جاسوسی کرنے والے' نیک کاموں میں شرکت اور چندے سے مختلف حیلوں حوالوں سے روکنے والے' پردہ اور سود کے متعلق اللہ کی باندھی ہوئی حدوں کو اپنی روشن خیالی کے زعم میں توڑ ڈالنے والے' ان گناہوں کو گناہ نہ سمجھ کر ان پر فخر کرنیوالے' لڑائی جھگڑوں کو طرح طرح کے پُر فریب طریقوں سے طول دینے والے' اپنی برائی کا نقارہ اپنے ہاتھ سے پیٹنے والے' پاک و پاکیزہ گروہوں کی جانب بلا استحقاق اپنی نسبت دینے والے' اور پھر یہ ساری زیادتیاں محض اپنے جتھے اور اپنے سرمایہ' اپنی پارٹی اور اپنے فنڈ کے بل پر کرنے والے' جب تک روئے ارض پر موجود ہیں' کون کہہ سکتا ہے کہ صبحِ سعادت کی پوری نورانیت و ضوفشانی کے ساتھ شبِ باطل بھی اپنی پوری تیرگی و سیاہی کے ساتھ موجود نہیں؟

ان بدنصیبوں کی بڑی شامت یہ ہوتی ہے کہ انہیں جب اللہ کی نشانیوں پر توجہ دلائی جاتی ہے' جب انہیں ان کے کرتوتوں کے نتائج پر آگاہ کیا جاتا ہے' جب انہیں احکامِ الٰہی پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو یہ بے توجہی سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ

اور بجائے توجہ والتفات کے کہنے لگتے ہیں کہ یہ تو وہی سنی سنائی پرانی کہانیاں ہیں۔ پستی و گمرہی کا یہ آخری مرتبہ ہوتا ہے جب نصیحت و موعظت بھی تلخ معلوم ہونے لگتی ہے، جب راستی سے بے تعلقی و بیزاری اس حد تک پہنچ جاتی ہے، جب حق وصداقت سے سارا رشتہ ٹوٹ کر پورا اعتماد صرف اپنی ذکاوت و ذہانت اور اپنے جتھے اور اپنے سرمایہ پر رہ جاتا ہے تو اس وقت عذاب الٰہی اس شکل میں نازل ہوتا ہے کہ اس بدبخت کی ناک پر داغ — سَنَسِمُهٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ — لگا دیا جاتا ہے اور اس کے چہرے کو داغ دار کر دیا جاتا ہے اور اس کی توہین و رسوائی کا سامان دنیا و آخرت دونوں عالموں میں کر دیا جاتا ہے۔ آخرت میں تو ناک پر جس طرح داغ لگایا جائے گا اس کا حال وہیں معلوم ہو سکتا ہے، البتہ دنیا میں ناک پر داغ لگنے کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ ہر وہ شے جو انسان کو ایسا بدنام و رسوا کر دے کہ پھر وہ رسوائی اس سے دفع نہ ہو سکے۔ ہر وہ شے جو کسی کی سفیدی میں سیاہی لگا دے، ہر وہ شے جو کسی کے ایسے شرمناک جرم کو منظرِ عام پر لے آئے جس کے بعد مجرم منہ دکھانے کے قابل نہ رہے ا

۱؎ فعلّمهٗ بعلامةٍ یعرف بها (راغب) لنرمه عارا لا ینمحی عنه (ایضاً)

بنبتین امره بیاناً واضحاً حتّٰی یعرفوه فلا یخفٰی علیهم

کما لا تخفٰی السمة علی الخرطوم (ابن جریر)

قال قتادة معنی ذالك شین لا یفارقه (ایضاً)

سلحق به شیئاً لا یفارقه (خازن)

هو عبارة عن یذله غایة الاذلال (بیضاوی)

خرطوم کا لفظ لانے میں، جو لغت میں ہاتھی اور سؤر کی ناک کو کہتے ہیں، کمالِ حقارت اس کی منظور ہے گویا وہ شخص انسانیت سے نکل کر خسیس ہونے میں مثل سؤر کے اور تکبر میں مثل ہاتھی کے ہو گیا ہے . . . . ہر جانور کی ناک اوپر کی طرف اٹھی ہوتی ہے لیکن ہاتھی اور سؤر (باقی اگلے صفحہ) (شاہ عبد العزیز دہلوی)

اس کے لئے "وَسَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُوْمِ" اس کی "ناک کا داغ" ہے[2]۔ حافظِ حقیقی ایسے ناک کے داغ سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔

کی ناک نیچے کی طرف جھکی اور پسشکی رہتی ہے۔ مو خرطوم کے ذکر میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی تمام ہمت پستی کی طرف رجوع تھی۔ (ایضاً)

[2] مطلب یہ ہے کہ جن باتوں کے ذریعہ سے وہ اپنی عزت قائم کرنا چاہتا ہے وہی آخر اس کی ذلت کا موجب بن جاتی ہیں۔ (مولانا محمد علی جوہری)

اُسوۂ حسنہ

اُسوۂ حسنہ

امانتِ الٰہی

بزمِ کائنات اپنی ساری دلفریب زینتوں اور دلکش آرائشوں کے ساتھ سج چکی، طلسم خانۂ فطرت اپنی تمام ندرتوں اور نیرنگیوں کے ساتھ تیار ہو چکا، نگارخانۂ موجودات کا ایک ایک نقش آب و رنگ کی جگمگاہٹ سے چمک اٹھا، اس وقت ماکان وما یکون کا سب سے زیادہ بے بہا سب سے زیادہ عزیز الوجود گوہر "امانتِ الٰہی" کے نام سے کثرت کے بازار میں پیش ہوا اور وحدت کے خلوت کدہ سے آواز آئی کہ:

"ہے کوئی جو اس گوہرِ شرف کا حامل بن سکے؟ ہے کوئی جو اس بارِ امانت کو اٹھا سکے؟"

عالمِ ملکوت میں سناٹا چھا گیا، عالمِ ناسوت پر لرزہ پڑ گیا، پہاڑ تھرتھرائے، سمندر کی موجیں رک گئیں، ماہتاب ماند پڑ گیا، آفتاب کی ہمت نے جواب دے دیا، اونچے آسمان نے اپنے دوشِ ناتواں کو اس کا اہل نہ پا کر آنکھیں نیچی کر لیں، پھیلی ہوئی زمین اپنے عجز و درماندگی کے احساس سے سمٹ کر رہ گئی۔ اس وقت ضعیف و ناتواں، کمزور و حقیر، ظلوم و جہول خاک کا پتلا آگے بڑھا اور اپنی ہمت کے بازوؤں کو پھیلا کر یہ بارِ عظیم اپنے سر لے لیا۔

صبحِ محشر

خاک نژاد آدم کی بے شمار نسلیں پیدا ہوئیں اور رخصت ہو گئیں، پھیلیں اور بڑھیں، ابھریں اور مٹیں، یہاں تک کہ عالمِ عنصریات کی شبِ دراز ختم ہوتی ہے اور صبحِ محشر کا طلوع ہو جاتا ہے۔ کمزور و جلد باز

خطا کار و نسیاں شعار، انسان طلب ہوتا ہے اور اس کا ہر فرد "امانت" کا حساب سمجھانے حاضر ہوتا ہے۔ افراد کی تعداد حدِ شمار سے خارج ہے، ریاضی کا ہر عدد سب کی گنتی بتانے سے قاصر ہے۔ اچھے اور بُرے، فاسق و فاجر، مومن و کافر، عالم و جاہل، شاہ و گدا، امیر و فقیر، حکیم و شاعر، عابد و زاہد، ولی و درویش، سب ایک ایک کر کے صف در صف حاضر ہو رہے ہیں، لیکن کسی ایک کا بھی نامۂ عمل فطرت کے محاسبہ پر پورا نہیں اترتا۔ کسی ایک کا بھی دامنِ امانت، خیانت کے داغ سے پاک نظر نہیں آتا۔ کسی ایک کی بھی فردِ اعمال ایسی نہیں جو دعوے کے ساتھ پیش ہو سکے۔ ہر سمت حسرتیں، ندامتیں، پشیمانیاں اور پریشانیاں ہیں، زاریاں اور بیقراریاں، افسردگیاں اور غمگینیاں ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ نفوسِ قدسیہ تک، جو دوسروں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے خلق ہوتے تھے اور جو عرش کا پیام لے کر فرش پر آتے تھے، آج اپنی اپنی حالت میں گرفتار ہیں اور زبانوں پر نفسی نفسی کا وظیفہ جاری ہے۔

گستاخ و شوخ چشم انسان، اس وقت بھی تمرد و خیرہ سری سے باز نہیں رہتا اور سوال کر بیٹھتا ہے کہ ایسی ناقص ہستیوں کے وجود میں لانے کا کیا ثمرہ تھا، جن میں سے کوئی ایک بھی معیارِ کمال پر پوری نہیں اترتی؟ اس بے شمار انبوہ کو خلعتِ وجود سے مشرف کرنے کا کچھ بھی حاصل تھا، جس کا ایک فرد بھی اپنے مقصدِ آفرینش کو پورا نہ کر سکا؟

حریمِ قدس سے آواز آتی ہے کہ:

دیکھ اے جاہل انسان، اور اپنی جہالت کا اقرار کر۔ سن اے نادان آدم زاد، اور اپنی نادانی پر شرما۔ یہ پیکرِ نورانی جو تیرے سامنے عرصۂ محشر میں موجود، اپنی ذات کی طرف سے فارغ و مطمئن اور دوسروں کے نجات دلانے کی کوشش میں مصروف و سرگرم نظر آ رہا ہے، تیری ہی طرح ایک انسان تھا۔ تیری ہی طرح اس کا خمیر بھی آب و گل سے تھا، تیری ہی طرح خاک کے ذرّوں سے اپنے جسدِ عنصری کی ترکیب رکھتا تھا لیکن ہمارا عبدِ کامل تھا، ہماری امانت کا پورا امین اور اپنے عہد کو نباہنے والا، قیدِ عناصر میں داخل ہونے سے قبل ہر وقت ہماری حمد و ثنا میں مشغول رہا، تو ہم نے احمد (بہت تعریف کرنے والا) کے نام سے پکارا، اور اس کا صلہ یہ دیا کہ جب عالمِ آب و گل میں پابند بنا کر اُسے بھیجا تو اس کا لقب محمدؐ (بہت تعریف کئے گئے) رکھا۔ دیکھ اے غافل انسان کہ آج نہ صرف ہم اپنے اس سب سے اچھے اور سب سے پیارے بندے کو کیا درجہ نصیب کرتے ہیں، بلکہ جس کسی نے اس کی پیروی

کی بھی کوشش کی اس کے لئے بھی آج ہمارے ہاں کیا کیا سرفرازیاں اور سربلندیاں موجود ہیں۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ جایئے۔ حکیموں اور داناؤں کے سوانح حیات پڑھ جایئے۔ درویشوں اور عالموں کے کارناموں پر نظر کر جایئے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں سے واقفیت حاصل کر لیجئے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی اصلاح، بڑے سے بڑے انقلاب، بڑے سے بڑے اجتہاد کا مطالعہ کر جایئے۔ ہر اصلاح، ہر دعوت، ہر تبلیغ، کسی نہ کسی ملک، کسی نہ کسی قوم، کسی نہ کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص و محدود آپ کو ملے گی۔ حضرت مسیحؑ صرف بنی اسرائیل کے گلوں کی بھیڑوں کو بچانے کے لئے آئے تھے ـــــــ حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت صالحؑ سب کا روئے سخن صرف اپنی اپنی قوم کی جانب تھا۔ دنیا کے اس عالمگیر کلیہ سے اگر کوئی استثناء ہو سکتا ہے تو وہ محمد عربی (روحی فداہ) کی دعوت و پیام کا تھا۔ رسولؐ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کسی ایک ملک کسی ایک قوم، کسی ایک زمانہ کے لئے نہیں، ہر ملک، ہر قوم، ہر زمانہ کے لئے ہے۔ تمدن انسانی کی ہر سطح کے متناسب، حالات بشری کے ہر درجہ کے لئے موزوں اور معاشرت قومی کی ہر شان کے شایاں۔

کمال اور ختم نبوت

سید المرسلینؐ کا ایک لقب خاتم النبیینؐ بھی ہے۔ ختم نبوت کے معنی بالکل واضح ہیں۔ جب ایک پیام اس قدر جامع و مکمل آچکا کہ اب اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی گنجائش ہی نہیں باقی، تو کسی جدید پیام کا آنا سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے۔ پیام کی ہمہ گیری کے معنی ہی یہ ہیں کہ آئندہ کے لئے سلسلۂ پیامات منقطع۔ عرب کے امی کے لائے ہوئے پیام نے علی الاعلان اپنا دعویٰ ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ میں ہر امکانی ضرورت زندگی کے لئے مکمل ہدایت نامہ ہوں اور آج تک بڑے سے بڑا مخالف بھی اس دعویٰ کو کسی دلیل سے جنبش نہ دے سکا۔

پیام و پیامبر

اس قدر جامع و مکمل پیام کے لئے ضروری تھا کہ اس کے لانے والے کی ذات بھی ہر حیثیت سے

کامل و مکمل ہو۔ اللہ کا بھیجا ہوا پیام، لکھا لکھایا، مرتب کتاب کی شکل میں بھی کسی پہاڑ یا درخت پر آسمان سے اتر سکتا تھا، لیکن حکیمِ مطلق کی مشیت نے "پیام" اور "پیامبر" دونوں کو ایک دوسرے کے لئے بطور لازم و ملزوم قرار دے دیا، اور دونوں کو ایک دوسرے کی تصدیق کا ضامن، لیکن ترتیباً پیامبر کا وجود، پیام پر مقدم ہے۔ دنیا کا یہ آخری ہادی و رہنما پورے چالیس برس اپنے ہم جنسوں کے درمیان رہ لیا، جب جا کر اس پر پیامِ حق نازل ہونا شروع ہوا، اور اس کے بعد تیئس سال کی مدت اور، اس نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے درمیان گزار دی۔ اس کی پاک و پاکیزہ زندگی اس وقت بھی دشمنوں کے لئے ایک کھلے ہوئے چیلنج کی طرح موجود رہی کہ کوئی اٹھے اور اس میں عیب نکالے، کوئی بڑھے اور اس پر حرف گیری کرے۔ ابوجہل اور ابولہب جیسے دشمن اٹھے اور بڑھے، لیکن اس مقدس سیرت، اس پاکیزہ زندگی اور اس پاک معاشرت میں ایک بات بھی قابلِ گرفت نہ پا سکے۔

محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ بنا کر نہیں بھیجے گئے، کسی دوسرے عالم کی مخلوق کی حیثیت سے نہیں اتارے گئے، حوائجِ بشری سے بے نیاز ہو کر نہیں مبعوث ہوئے۔ انسان بنا کر بشریت کے تمام اوصاف و لوازم، تمام احتیاجوں اور ضرورتوں کے پابند بنا کر اس ظلمت کدۂ گیتی کو مطلعِ انوار کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ شادیاں آپ نے کیں، ایک نہیں کئی کئی۔ اولادیں آپ کے متعدد ہوئیں، بعض زندہ رہیں اور بعض نے حضورؐ کے سامنے وفات پائی۔ دوست بھی حضورؐ کے بہت سے تھے اور دشمن بھی تھے۔ مخلصین کا بھی ایک گروہ تھا اور منافقین کا بھی۔ عسرت کا بھی زمانہ گزرا اور خوشحالی کا بھی۔ لڑائیاں بھی بہت سی ہوئیں اور امن کا زمانہ بھی گزرا۔ محاربات میں کبھی فتح بھی ہوئی اور کبھی اس کے برعکس۔ خلقت کے ردّ و انکار کا بھی تجربہ فرمایا اور مقبولیت اور مرجعیت کا بھی۔ غرض انسانی زندگی میں گرم و سرد، نشیب و فراز کے جتنے مواقع پیش آ سکتے ہیں سب سے ہو کر وہ پاک و طاہر زندگی گزری، اور اس طرح بے داغ گزری کہ آج محض اس کا مطالعہ سارے عالم کے لئے ایک مستقل درس بن سکتا ہے۔

جامعیت

حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک کی یہ جامعیت صرف اس لئے تھی کہ ہر

فرد بشر اس نمونہ کو اپنے پیش نظر رکھے اور جہاں تک اس کا ظرف و بساط اجازت دے انہیں قدموں کے نقش پہ چلے۔ گلستانِ دہر میں بار بار روح پرور بہاریں آ چکی ہیں لیکن موسمِ ربیع کا یہ گلدستہ ایسا ہے جو ہر ملک، ہر زمانہ، ہر قوم کے مشامِ جاں کو معطر رکھے گا۔ آج دنیا کی سب سے بڑی شامت یہی ہے کہ اس نے سب سے زیادہ کامل و مکمل نمونہ کی طرف سے قطع نظر کر لی۔ غیروں کا ذکر نہیں، خود ہم کلمہ گویانِ اسلام کی بدبختی یہی ہے کہ ہم نے آفتابِ ہدایت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے تئیں یا تو اندھیرے میں ڈال رکھا ہے اور یا اگر روشنی کی طلب ہے بھی تو ٹمٹماتے ہوئے چراغوں اور لالٹینوں پہ قناعت ہے۔

ہم میں سے آج کتنے بدبخت مسلمان ایسے ہیں جو خوبی و کمال کا معیار یورپ کے طور و طریق کو سمجھ رہے ہیں۔ قومی تعلیم اس لئے ضروری ہے کہ یورپ میں اس کا رواج ہے۔ معاشرت کو اعلیٰ معیار پر اس لئے لانا چاہئے کہ یورپ کا طرز یہی ہے۔ سود خواری اس لئے بہتر ہے کہ یورپ اسی ذریعہ سے ترقی کر رہا ہے۔ یہ ہمارے دماغوں کا ایک عام طرزِ استدلال ہو گیا ہے۔ اس سے اتر کر وہ طبقہ ہے جو مذہبی سمجھا جاتا ہے۔ ان بے چاروں کی شامت یہ ہے کہ بجائے سرکارِ رسالتؐ سے اکتسابِ فیض کرنے کے، انھوں نے ساری جستجو اور تگ و دو محض کسی عالم یا درویش تک محدود کر رکھی ہے۔ حالانکہ کوئی اُمتی کتنا ہی بلند پایہ ہو، ظاہر ہے کہ رسولِ خداؐ صلعم کی نعلین مبارک کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔

اگر آج ہم اس بڑے "امین" کے نقشِ قدم پر چلتے ہوتے تو ہم میں خیانت و بددیانتی کا گزر نہ ہوتا۔ اگر آج ہم اس "رؤف رحیم" کے پیرو ہوتے تو ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی جانب سے بے اعتقادی و بدگمانی نہ ہوتی۔ اگر آج ہم اس غارِ حرا کے بیٹھنے والے کے آثار مبارک کو اپنا سرمۂ چشم بناتے تو ہمارے باطن میں کسی قسم کی گندگی باقی نہ رہ جاتی۔ اگر آج ہم فاتح بدر کی عظمت، دل سے کرنے والے ہوتے تو مخالفین کے مقابلہ میں ہمیں شکستیں نصیب نہ ہوتیں۔ اگر آج ہم رحمۃ اللعالمینؐ کے پیام پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوتے تو اپنی جیسی مخلوقات کے ساتھ ہمیں بے ہنگامگی و مخالفت نہ ہوتی۔ اگر آج اپنے سچ بولنے والے اور سچ کے برتنے والے ہی کے طریقہ پر ہم قائم ہوتے تو جھوٹ کا ہماری آبادیوں میں نام و نشان ہی نہ ہوتا۔ اگر آج ہم کو اسم پاک احمدؐ کی لاج ہوتی تو

اللہ کی حمد و ثنا سے ہمیں اس قدر گریز نہ ہوتا۔ اگر آج ہم کو اسمِ گرامی محمدؐ سے عمداً کوئی واسطہ ہوتا تو اپنی موجودہ پستی و بدنامی سے یہ مراحل دور ہوتے۔ آج جبکہ سارے ملک میں میلاد مبارک کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہوں گی، کیا یہ بہتر نہ ہو گا اُن کے ساتھ ساتھ ہم اپنے خلوت خانۂ قلب میں بھی کچھ دیر کے لئے ذکرِ پیمبرؐ و یادِ رسولؐ کی محفل گرم کریں!

ولادت باسعادت

صدا ہاتف نے دی اے ساکنانِ خطۂ ہستی
ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اُجڑی ہوئی بستی

ضعیفوں، بے کسوں، آفت نصیبوں کو مبارک ہو
یتیموں کو، غلاموں کو، غریبوں کو مبارک ہو

مبارک ٹھوکریں کھا کھا کے پیہم گرنے والوں کو
مبارک دشتِ غربت میں بھٹکتے پھرنے والوں کو

مبارک ہو کہ دَورِ راحت و آرام آ پہنچا
نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آ پہنچا!

بصد اندازِ یکتائی بغایت شانِ یکتائی
امیں بن کر امانت آمنہؓ کی گود میں آئی

——— حفیظ جالندھری

ولادت باسعادت[1]

آگے کچھ سننے سنانے سے قبل ذہن کے سامنے نقشہ' تاریخ کی بڑی بڑی ضخیم و مستند کتابوں کی مدد سے، چھٹی صدی عیسوی کے آخر اور ساتویں صدی عیسوی کے شروع کی دنیا کا، خصوصاً مہذب و متمدن دنیا کا، لے آیئے۔ دنیا کی زبردست اور نامور طاقتیں اس وقت دو تھیں، جن کے نام سے سب تھراتے تھے اور جن کا لوہا مشرق و مغرب مانے ہوئے تھے۔ مغرب میں رومن امپائر یا شہنشاہی روم، اور مشرق میں پرشین امپائر یا شہنشاہی ایران —— دونوں بڑی بڑی فوجوں اور لشکروں کے مالک، دونوں میں زر و دولت کی افراط اور دونوں کا تمدن عروج پر۔ لیکن دونوں کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ۔ عیش و عشرت نے مردانگی کی جڑیں کھوکھلی کر ڈالی تھیں اور روح و قلب کے روگ ہر قسم کے پھیلے ہوئے —— انسان کا رشتہ اپنے خالق سے بالکل ٹوٹا ہوا۔ توحید کا چراغ گویا بالکل بجھا ہوا —— اور یہی حال کم و بیش ساری دنیا کا۔ تفصیل کا وقت کہاں، ورنہ ہندوستان، چین، مصر وغیرہ ایک ایک ملک کا نام لے کر اس وقت کے اخلاقی زوال کی تصویر آپ کے سامنے پیش کردی جاتی۔

اس وبائے عام میں ملک عرب کا نمبر خاص۔ شاعری کے آرٹ میں یہ قوم یقیناً طاق اور تجارت کے کاروبار میں بھی بہت ممتاز —— چند اور اخلاقی جوہر بھی ان کے اندر خوب چمکے ہوئے، بہادری اور سپہ گری، فیاضی، مہمان نوازی میں ان کا سکہ عرب و جوار ہی میں نہیں، دور دور تک بیٹھا ہوا لیکن اس سے آگے چلئے تو یہ لوگ بالکل کورے۔ آج اسے لوٹ لیا، کل اُسے ختم کر دیا۔ بے حیائی فیشن میں

---

[1] لکھنؤ ریڈیو سٹیشن سے۔ ۱۹ اپریل ۱۹۴۸ء (۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ) کی شام کو۔ وقت ۵ امنٹ۔

داخل اور بے ستری جزوِ عبادت۔ شراب کی محفل جمی تو شام کی صبح ہوگئی۔ جوئے کی بازی لگی تو جسم سے کپڑے تک اتر گئے اور خون کے انتقام در انتقام کا سلسلہ جو چلا تو کہنا چاہئے کہ صدی کی چھٹی ہوگئی، عمریں ختم ہوگئیں، پشتیں گزر گئیں اور جھگڑا چکائے نہیں چکتا ــــ تو یہ تھا چھٹی صدی عیسوی کی آخری تہائی کا ملک عرب، جس کے مشہور ترین اور مقدس ترین شہر مکہ میں ۵۷۰ء میں ایک روز صبح صادق کے وقت قوم کے شریف ترین گھرانے میں ایک جیتا جاگتا چاند عالم ظہور میں آیا، جس کی نورانیت سے، دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ان کے گھر کے در و دیوار تک جگمگ کرنے لگے ــــ زچہ خانہ کے مادی حدود کی بساط ہی کیا، یہ نورانیت تو اس غضب کی تھی کہ مشرق و مغرب کے سرے اس سے جگمگا اٹھنے والے تھے۔

عرب کے جغرافیہ کا خاکہ تو آپ کے ذہن میں ہوگا ہی، طول البلد ۱۲، اور ۲۲۔ عرض البلد ۲۵ اور ۶۰۔ ایک طرف مصر اور حبشہ اور طرابلس اور سارا براعظم افریقہ، دوسری طرف ملک روم و شام، فلسطین اور سارا یورپ۔ تیسری جانب عراق اور ایران اور سارا ایشیا۔ اور چوتھی سمت میں سمندر ہی سمندر۔ گویا معمورۂ عالم، خصوصاً اس وقت کی دنیائے مہذب کا عین چوراہا۔ اور پھر جو تجارتی شاہراہ مشرق کو مغرب سے ملا رہی تھی اور بحرِ ہند و خلیج فارس کے تجارتی مال کو خشکی کے راستہ مصر، روم و شام تک پہنچا رہی تھی، وہ بحرِ احمر کے برابر برابر گویا ایک خطِ مستقیم بناتی ہوئی ٹھیک اسی عرب ہی کے مغربی کنارے پر تو تھی۔

تاریخ اور جغرافیہ، دیکھئے دونوں کی شہادت کیا گزر رہی ہے۔ یہی نا کہ اکیلے عرب ہی کی نہیں، دنیا کی اصلاح کے لئے، اس سے بڑھ کر ضروری وقت و زمانہ اور کون ہو سکتا تھا اور مقام اس کے لئے عرب سے موزوں تر کونسا ہو سکتا تھا ــــ زمان و مکان دونوں کے لحاظ سے ولادت ایسی "باسعادت" اور کون سی ہوگی؟ والد ماجد کا نام عبد اللہ، توحید و عبودیت کی طرف کتنا صاف اشارہ۔ والدہ ماجدہ بی بی آمنہ، امن و امان کے حق میں ایک مستقل فالِ نیک ــــ آنکھ یتیمی میں کھلی ــــ والد ماجد نورِ عین کے دیدارِ جمال سے قبل ہی سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے تھے۔ جس کو سارے عالم کا سہارا بنایا جانے والا تھا، حق تھا کہ قدرت اُسے وجود میں بغیر ظاہری سہارے کے لائے اور اس کا سہارا اور دلدار ان سے بجز ذاتِ حق کے اور کوئی ساتھی نہ رکھے۔

نام نامی دادا عبدالمطلب نے "محمدؐ" رکھا۔ لفظی معنی "بہت حمد کیے گئے" کے۔ ذات ستودہ صفات کے لئے اسم بامسمّٰی۔ دوسرا نام "احمدؐ" پڑا، جس کی زندگی حمد میں کٹتی اور جسے اٹھنا بھی مقامِ محمد میں ہے۔ اس کے لئے اس سے بہتر نام اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ پلے، بڑھے، کھیلے، چلے پھرے، پلے جھلے۔ بچپن یوں گزرا کہ خود معصومیت اس بچپن پر فخر کرنے لگی۔ جوان ہوئے تو نیکی اور پارسائی، طاعتِ حق اور خدمتِ حق بلائیں لینے لگیں۔ جوانی یوں بھی دیوانی ہوتی ہے، اور پھر ایسے ملک وقوم میں جہاں عیش پرستی اور لذت کوشی کی ہر راہ کھلی ہوئی۔ قدم کی ہر لغزش مستانہ پر رواج اور فیشن کی مُہر لگی ہوئی۔ اس ماحول میں اور سِن و سال میں، محلہ اور بستی والوں نے، کنبہ اور قبیلہ والوں نے لقب دیا تو کیا؟ "امین" —— امین کا لفظ بڑا وسیع اور جامع ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ VIRTOUS ہی سے کیا جا سکتا ہے یعنی محمدؐ دیانت دار بھی ہیں اور راست باز بھی، نظریں نیچی رکھنے والے بھی اور سب کی خدمت کرنے والے بھی —— کتنے ایسے ہیں جن کی قسمت میں ہر وقت دیکھنے والوں کی زبان سے یہ شہادت آتی ہے۔

زندگین بھر گلہ بانی کی —— جس کے نصیب میں آگے چل کر قوموں اور اُمتوں کا گلہ بان ہونا تھا، اس کے لئے کتنی اچھی تعلیم —— جوان ہوئے تو تجارت کی —— جس کا کام آگے بڑھ کر جنت کے تمسکات (SHARE CERTIFICATES) ہلکے پھلکے داموں خرید دانا ہونا تھا، اس کے لئے کتنا موزوں اور پُر معنی پیشہ۔ امانت و دیانت اور کاروبار میں مہارت دیکھ کر ایک دولتمند بیوہ نے شادی کی درخواست از خود کی اور ۲۵ سال کے سِن میں اس جوانِ رعنا کی خانگی زندگی بھی شروع ہو گئی۔ سِن کے چالیسویں میں تھے کہ مرتبۂ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ ساری تیاریاں اسی لئے تھیں اور ۲۳ سال تک اپنے خالق و مالک کا پیام بندوں کو سناتے رہے —— نکاح کئی فرمائے۔ اولادیں بھی متعدد ہوئیں۔ لڑائیاں بار بار سخت اور خونریز اپنے ہم وطنوں اور ہم قوموں سے لڑنا پڑیں۔ ہمسایہ ملکوں سے معاہدے بھی کئے۔ ملک کے انتظام ہر طرح کے فرمائے۔ دیوانی، فوجداری، قانونی فیصلے ہر قسم کے کرنے پڑے۔ غیر مسلم تاجروں سے نامہ و پیام رکھا۔ بے شمار نمازیں پڑھیں اور پڑھائیں۔ خطبہ یا برجستہ تقریریں، خدا معلوم کتنی کر ڈالیں۔ غرض یہ کہ دنیا کو ہر پہلو پر خوب برتا۔ لیکن دنیا میں ایک بار بھی نہ پڑے —— جیسے غوطہ خور نے سمندر میں گر کر غوطہ لگایا اور جسم کا ایک رواں بھی بھیگنے نہ پایا۔

اور جب ۶۳ سال کی عمر شریف میں جون ۶۳۲ء میں اس فانی دنیا کو چھوڑا، تو دل میں تمنا اپنے رفیقِ اعلیٰ کے دیدار کی بسی ہوئی تھی اور پاک اور معصوم ہونٹوں سے آواز اَللّٰھُمَّ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی کی چلی آرہی تھی۔

تعلیم یہ لائے کہ اپنی عقلوں اور ذہنوں کو مادیات کے جنجال میں نہ پھنساؤ۔ اسبابِ ظاہری و قریبی کے دھوکے میں نہ آؤ۔ ان سے کام تو یقیناً لو، اور پوری طرح لو، لیکن اصلی سہارا اور حقیقی بھروسہ ایک اَن دیکھی ذات ہی کا رکھو۔ وہی سب کا پیدا کرنے والا، وہی سب کو پالنے جلانے والا اور وہی سب کو آخر میں مارنے اٹھانے والا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہ ذات میں نہ صفات میں ــــــ زندگی کے چھوٹے بڑے ایک ایک عمل میں اپنی ذمہ داری محسوس کرو اور مادی و جسمانی زندگی کو سلسلہ ہستی کا ایک جزو اور بہت ہی محدود جزو سمجھو۔ تنگ نظری سے کام لے کر اسی کو کُل سمجھ لینے کے دھوکے میں نہ پڑو۔ اس "آج" کا عنقریب "کل" ہونے والا ہے۔ ہر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو کر رہے گا۔ ساری تیاری اس یومِ حساب کے لئے رکھو۔

قانون یہ بنایا کہ کوئی کسی حال میں کسی پر ظلم نہ کرے۔ بڑائی اور چھٹائی اس عالمِ آب و گِل کا بنیادی قانون ہے۔ کوئی امیر رہے گا کوئی غریب۔ لیکن بڑے کو چھوٹے کے دبانے کا اور امیر کو غریب کے پیسنے کا، حاکم کو محکوم کے ستانے کا قطعاً کوئی حق نہیں۔ میاں اور بیوی، بادشاہ اور رعایا، زردار و نادار، ادائے حقوق کے لحاظ سے اللہ کی عدالت میں سب بالکل برابر ہیں۔ دھیان اپنے فرائض کا رکھو۔ اپنی ذمہ داریوں کو ایک دوسرے کے حق میں ادا کرو۔ مطالباتِ حقوق کا نام لے کر غل غپاڑہ نہ کرو۔ دنیا کو ہنگامہ و فساد کے تھکے میں نہ ڈالو۔ تلوار ہاتھ میں اٹھاؤ بھی تو دنیا میں امن قائم کرنے کو، اللہ کی حکومت کا سکہ از سرِ نو چلانے کو۔ سود کا، رشوت کا، خیانت کا ایک ایک پیسہ حرام سمجھو۔ بے حیائیوں کے قریب نہ جاؤ۔ ننگے ناچ کی قدردانی نہ کرو۔ نشہ کی چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔ ترکہ سب وارثوں کو ان کے حصہ رسدی کے مطابق تقسیم کرو۔ یہ نہ ہو کہ سب کچھ بڑا لڑکا پا گیا اور دوسرے لڑکے لڑکیاں منہ دیکھتی ہی رہ گئیں۔ جوئے کی کمائی، چوری کے مال کی طرح گندی سمجھے رہو۔ بیگانی عورت کی طرف نظر بھی نہ اٹھاؤ۔ ہاں جائز شادیاں اگر ضرورت یا مصلحت سمجھو تو ادائے حقوق کے ساتھ ایک سے زائد بھی کر سکتے ہو۔

غرض ان ساری ہدایتوں کو اپنے پروردگار سے سیکھ کر جب وہ رہبرِ اعظم اس دنیا سے رخصت ہوا تو وہ دنیا کے ہاتھ میں ایک مکمل ہدایت نامہ اور جامع و مفصل دستور العمل دے کر گیا۔ اور اس کی یہ ساری تعلیمات محض لفظی نہ تھیں، وہ ان سب کی مشق سالہا سال تک اپنے سامنے کرا کر گیا ـــــ اسکی قوم کے جاہلوں اور فاسقوں نے اس کا پیچھا لیا۔ اسے اپنے مشن کے تحفظ کے لئے مکہ معظمہ سے جلا وطن ہو کر ڈھائی پونے تین سو میل کی منزلیں طے کر کے مدینہ جا بسنا پڑا تھا، اور بے رحمانہ سختیوں کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو اسے اور اس کے وفادار ساتھیوں کو جھیلنا نہ پڑی ہو۔ ساری مشکلات پر وہ اپنی معجزانہ ہمت و تدبیر سے غالب آیا۔ ملکوتی اور لاہوتی قوتیں پہاڑوں کو اس کے سامنے پانی کرتی گئیں۔ اس نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت ایک لاکھ سے اوپر کوئی سوا لاکھ کی چھوڑی اور عرب کے کوئی ۱۰ لاکھ مربع میل پر وہ اپنی عادلانہ حکومت کا نقش قائم کر گیا۔ اس کی ہمہ گیر، بے نظیر اور جمال و جلال اور کمال سب کی جامع شخصیت کے لئے ہم کو، آپ کو نہیں، یورپ کو آج تک اعتراف ہے کہ:

"وہ دنیا کے تمام انبیاء اور مذہبی شخصیتوں میں کامیاب ترین ثابت ہوئی۔"

THE MOST SUCCESSFUL OF ALL PROPHETS AND RELIGIOUS PERSONALITIES.

اس حوالہ کے لئے ملاحظہ کیجئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے گیارہویں ایڈیشن کی جلد ۱۵، صفحہ ۸۹۸۔

اور اس کے لائے ہوئے لاجواب اور بے مثال خدائی کلام کے لئے بھی آج اسی یورپ کو اقرار ہے کہ اس سے زیادہ کثیر الاشاعت دنیا کے پردہ پر کوئی کتاب نہیں:

THE MOST WIDELY READ BOOK IN EXISTENCE

اس حوالہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے اسی انسائیکلوپیڈیا کے اسی ایڈیشن کی اسی جلد کا وہی صفحہ۔

یہ خراجِ عقیدت منکرین کی زبان سے کس کے حصے میں آیا ہے؟

اللّٰھم صل وسلم وبارک علیہ

رحمة للعالمين

رحمۃ للعالمین

رحمت للعالمین[1]

"میں شہادت دیتا ہوں کہ انسان بھائی بھائی ہیں۔"

جس کے منہ سے یہ سندر بول نکلے تھے، آج اس کی پیدائش کا دن ہے۔ اسی نے آکر دنیا کو یہ پیغام دیا تھا۔ بتایا تھا کہ نسل کی، جلد کی، رنگ کی یا وطنی تقسیم کی بنا پر کسی سے جنگ کرنا یا کسی کو حقیر اور ذلیل سمجھنا حماقت ہے۔ یہ ساری چیزیں غیر اختیاری ہیں۔ انسان کے کردار کا، اس کے شرف اور عظمت کا ان سے کیا سروکار۔ اور اسی نے آکر یہ منادی کی تھی کہ:

الخلق عیال اللّٰہ

مخلوق تو ساری، اللہ کا کنبہ ہے۔

فاحب الخلق الی اللّٰہ من احسن الی عیالہ

تو مخلوق میں، اللہ کی نظر میں محبوب ترین وہی ہے جو اس کنبہ کے ساتھ بہترین سلوک سے پیش آئے۔

مہر و محبت کے اس پیامبر کو، شفقت و الفت، ہمدردی و انسانیت کے اس سچے پیام رساں کو "رحمتِ عالم" نہ کہئے تو آخر کہئے کیا؟

آج اس کی پیدائش کا دن ہے جس نے اپنے پیرووں کو ہدایت کی تھی کہ حکمت و دانش تو تمہاری

---

[1] لکھنؤ ریڈیو سٹیشن سے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۴۹ء (۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ) کی شام کو۔ وقت ۱۰ منٹ!

کھوئی ہوئی چیز ہے تو تم جہاں کہیں بھی پاؤ اپنی ہی چیز سمجھ کر حاصل کر لو اور اس وہم میں نہ پڑے رہو کہ یہ غیروں کی ہے، اسے ہم ہاتھ کیسے لگائیں۔ اور ہاں اسی لیے یہ ہدایت بھی تو کی ہے کہ علم و دانش کی تحصیل سے غافل نہ رہو چاہے اس کے لئے چین ہی کا سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔ چین کا لفظ اس وقت کے عربی محاورہ کے مطابق انتہائی فاصلہ ظاہر کرنے کو ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ علم حاصل کرنے کی راہ میں کوئی بھی ملکی یا قومی تعصب حائل نہ ہونے پائے۔ یہ ہدایتیں آج بھی ایک دینی پیشوا کی زبان سے ایک حد تک نئی معلوم ہوتی رہیں اور پھر چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ دنیا مختلف چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور ٹولیوں میں بٹی ہوئی تھی اور ایک دوسرے کے خلاف نسلی اور وطنی تعصبات کی سنگین دیواریں اٹھی ہوئی تھیں، اس وقت عام رواداری اور عالمگیر انسانیت کی تعلیم عرب کے ایک اُمی کی زبان سے بجائے خود ایک معجزہ تھی۔

آج اس نبیؐ رحمت کی یاد منانے کا دن ہے جس کا فرمان ہے:

مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ

جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا وہ خود رحم سے محروم رہے گا۔

شفقت و مہربانی کا یہ حکم کسی قبیلہ یا قوم کے ساتھ محدود نہیں، بلکہ نوعِ انسان کے لئے ہے اور نوعِ انسان بھی کیوں کہئے، یوں کہئے کہ ساری مخلوقِ خدا کے لئے ہے، جس میں چرندے اور پرندے ــــ گھوڑے اور گدھے، کتے اور بلی، کبوتر اور مرغی سبھی شامل ہیں۔ اور بعض حدیثوں میں تو نام لے کر بعض بے زبان جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک پر بشارتیں آئی ہیں۔ عمل اس تعلیم پر ہو جائے تو آج ضرورت نہ کسی "انجمن برائے انسدادِ بیرحمی بر حیوانات" کی رہ جائے اور نہ کسی گھوڑے کی چابکوں سے چھلی ہوئی پیٹھ دیکھنے ہی کو مل پائے۔

آج اس رحمتِ عالم کا یومِ میلاد ہے جس کی لائی ہوئی آسمانی کتاب کا پہلا سبق تھا کہ خدا کا تعلق ربوبیت سارے ہی عالم و مافی العالم سے ہے۔ وہ خدا پروردگار قریشی کا نہیں، قومِ عرب کا نہیں، گوروں کا نہیں، کالوں کا نہیں، مشرقیوں مغربیوں کا نہیں، بلکہ نیکوں اور بدوں، بڑوں اور چھوٹوں، سرداروں اور زیردستوں، شہزوروں اور کمزوروں، انسانوں اور جانوروں، سب ہی کا پروردگار ہے ننھی سے ننھی، بے حقیقت مخلوق، پتھر کے کیڑے تک کی پرورش کرنے والا، اس کو اس کے کمالات کی طرف چلانے والا، وہی ایک ہے ــــ اخوتِ انسانی بلکہ ساری نظامِ کائناتی کی وحدت کی تعلیم اس سے

زیادہ مؤثر و دل نشین انداز میں اور کیا ہوگی ؟

اس نورِ نبوت نے جب اجالا شروع کیا ہے تو دنیا طرح طرح کی تاریکیوں اور گھرے گھرے اندھیروں میں لپٹی ہوئی تھی۔ جہالت نے ایک خدا کی خدائی میں ساجھے دار خدا معلوم کتنوں کو بنا دیا تھا اور مصلحِ برحق نے اپنی عظیم الشان اصلاحوں کا سنگِ بنیاد اسی عقیدۂ توحید کو رکھا۔ اس نے بندہ اور اس کے خالق کے درمیان ربط براہِ راست قائم کر دیا۔ درمیانی واسطوں کو مٹایا اور دلوں اور دماغوں کا سہارا ماسوا کی طرف سے چھڑایا۔ اور عقیدے کی ان بنیادی اصلاحوں کے معاً بعد وہ عملی زندگی کے سنوارنے اور سدھارنے میں لگ گیا، اور وہ قانون اور ضابطے اس نے اپنے اللہ کے حکم سے پیش کئے جو ایک طرف فرد کو سدھارتے گئے تو دوسری طرف سوسائٹی یا معاشرہ یا سماج کا اخلاق بھی نکھارتے گئے۔

شراب عرب سوسائٹی کا جزوِ اعظم تھی۔ ان کے اونچے طبقہ کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ دوستوں کی مجلس میں، برادری کی کسی دعوت میں، خاندان کی کسی تقریب میں، پیمانہ کی گردش اور جام کے دور کے بغیر بھی زندہ دلی باقی رہ سکتی ہے۔ اسی مصلحِ اعظم نے آکر یہ عادت چھڑائی اور جو ابھی کل تک شرابی اور بلانوش تھے، انھیں دم کے دم میں پاکباز، محتاط، تہجد گزار بنا دیا۔ جنگ جوئی، خونریزی، نبرد آزمائی گویا عرب کے خمیر میں داخل تھی۔ برسوں سے نہیں، صدیوں سے قبائلی اور خاندانی رقابتیں چلی آتی تھیں، اور عداوتیں گویا وراثت میں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ رحمتِ عالم نے آتے ہی اس کینہ کو ہر سینہ سے دھو دیا۔ اور جہاں بغض و نفرت کی بھٹیاں دہک رہی تھیں وہاں میل اور محبت کے پھول کھلا دیئے۔ یہ معجزہ تنہا عرب ہی کے لئے نہیں ہوا۔ عدل، خداترسی اور ادائے حقوق کے قانون ایسے تعلیم کر دیئے کہ ان پر عمل ہو تو آج بھی سارا عالم آتش کدہ سے گلزار میں تبدیل ہو جائے۔

سود در سود کے چکر سے دنیا جن مصیبتوں میں گرفتار چلی آرہی ہے وہ سب پر روشن ہے۔ غریبوں کا خون چوسنا اور اپنے اندر بجائے ہمدردی و شفقت کے سنگدلی اور بے دردی کے جذبات کو پرورش کرتے رہنا، سود خوار غریب کی قسمت کا نوشتہ ہے۔ اور پھر دنیا میں جو بڑی بڑی خونریز لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، سوچ کر دیکھئے کہ اگر بڑے بڑے سودی قرضے نہ ملتے تو یہ ہولناک اور انسانیت سوز جنگیں کبھی واقع ہو سکتی تھیں؟ دنیا کے اس سچے رہبر اور دینِ حق کے پیمبر نے انسانیت کی اس دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا اور اپنی شریعت کے ذریعہ اس کا پورا قلع قمع ہی کر کے چھوڑا۔ یہ شرح سود ہلکی ہو یا بھاری،

سودی معاملت کی ہر شکل اور ہر درجہ کو اس نے حرام ہی قرار دے دیا کہ بغیر اس حرمت کلی کے اس عذاب سے نجات پانا ممکن ہی نہ تھا۔

فحش و بدکاری کی وبا بھی دنیا پر ہمیشہ مسلط رہی ہے۔ مصر، یونان، روما کے بڑے بڑے حکیم اور فلسفی اس سے بچ نہ پا سکے بلکہ بہت سے تو خود ہی اس کا شکار ہو گئے۔ گندی شاعری، گندی مصوری، گندی نقاشی، گندے ناچ رنگ، یہ سب اس کے لوازم طرح طرح کی دل کشی اور رغبت افزا ناموں کے ساتھ رہے ہیں۔ محمد ابن عبداللہ کی لائی ہوئی شریعت نے ان ساری سڑی ہوئی لاشوں کے چہروں سے رنگین و خوشنما نقاب نوچ نوچ کر الگ کر دیئے اور ہر گندگی کی بیخ کنی بقدر اس کے مفسدہ کے کر دی۔

ان پیمبر میں اور وصف جو تھے وہ تو تھے ہی، ہزاروں کمالوں کا کمال یہ تھا کہ آپ حقیقت پسند REALIST اعلیٰ درجہ کے بلکہ بے نظیر تھے۔ آپ کی نظر عرفان ہمیشہ حقائق ہی پر رہتی تھی اور آپ کی شریعت نے احکام جتنے بھی دیئے ہیں وہ نہ شاعرانہ خیالی سبز باغ ہیں اور نہ فلسفیانہ وہمی نظریے ہیں، بلکہ تمام تر انسان کے کام آنے والی حال و مستقبل دونوں میں عملی ہدایتیں ہیں۔

عورت کے حق میں دنیا عموماً افراط و تفریط ہی سے کام لیتی آئی ہے۔ کبھی وہ گھٹائی گئی تو اتنی کہ جیسے اس کا شمار ہی دائرۂ انسانیت میں نہیں۔ اور کبھی بڑھائی گئی تو ایسی کہ جیسے مرد اس کے محکوم اور تابع ہیں۔ اس رسول کریم نے آ کر اس کا صحیح مرتبہ قائم کیا اور بتایا کہ عورت کسی حال میں مرد کی باندی نہیں بلکہ اس کی ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے اور ہر رشتہ میں اپنے خاص خاص حقوق رکھتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ذمہ خاص خاص فرائض بھی باپ کے، بھائی کے، بیٹے کے، شوہر کے لئے ہیں۔

غلاموں کو ایک دنیا ذلیل سمجھتی آ رہی ہے۔ لفظ غلامی، ذلت و پستی کا مرادف بن گیا تھا۔ اس نبی نے آ کر اس لعنت کو بھی دور کیا اور غلاموں کو انسانی حقوق ہی میں شریک نہیں کرایا بلکہ عملاً غلاموں اور آقاؤں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ چنانچہ ان نام کے غلاموں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو ان میں نہ صرف امیر و وزیر، سپہ سالار اور بہادر شاہ تک نظر آئیں گے، بلکہ بہت سے نامی دینی پیشواؤں، فقہ و حدیث اور تفسیر کے عالموں کے بھی مل جائیں گے۔

ضعیفوں، مسکینوں، اپاہجوں، یتیموں، بیماروں کے ساتھ حسن سلوک اور مدارات کی جو ہدایتیں اس ہادی کی لائی ہوئی کتاب اور خود اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں ملتی ہیں وہ اس کثرت سے ہیں

کر جمع کی جائیں تو خود ایک دفتر تیار ہو جائے۔ نمونہ کے طور پر اس وقت ایک حدیث مبارک کا خلاصہ سن لیجئے۔

"قیامت کے دن خدا اپنے بندے سے ارشاد کرے گا کہ:

"میں بیمار ہوا تم نے میری خبر نہ لی۔ میں بھوکا رہا تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔"

بندہ حیرت سے عرض کرے گا:

"الٰہ العالمین! یہ کیونکر؟ —— تیری ذاتِ پاک تو ہر بیماری اور بھوک سے بالاتر ہے۔"

ارشاد ہوگا کہ فلاں بیمار کو تُو دیکھتا ہوا چلا گیا، وہ ہم ہی تھے —— فلاں بھوکا تیرے علم میں آیا تھا، وہ ہم ہی تھے ——!"

حق یہ ہے کہ آپ کی نبوت پر اور جتنے دلائل ہیں بالفرض وہ سب معدوم ہو جائیں اور آپ کی شریعت کے صرف وہی حصے باقی رہ جائیں جو عام خلائق اور اس کے مختلف طبقوں کے ساتھ ہمدردی، محبت اور سلوک پر مشتمل ہیں تو تنہا یہی چیز آپ کی نبوت کے اعجاز کے لئے کافی دلیل بن سکتی ہے۔

اس رسولؐ نے جنگ کرنے سے حرام قرار نہیں دیا بلکہ اسے بعض حالات میں جائز اور بعض حالات میں واجب بھی بتادیا۔ البتہ اس پر قیدیں بڑی بڑی سخت لگا دی ہیں اور جہاد کو بجائے نفس پرستی یا ستم رانی کے ایک اعلیٰ درجہ کا مجاہدۂ نفس اور بہترین آلۂ دفع ظلم کا بنا دیا۔

اسی طرح اس نے دنیا جہان کے مجرموں، چوروں، ڈاکوؤں، خونیوں، شرابیوں، جواریوں کے ہاتھ میں عفوِ عام کا پروانہ نہیں تھا دیا بلکہ اس نے اپنے وہی REALIST یا مصلحِ اکبر ہونے کی رعایت سے، ہر پھوڑے پھنسی کے لئے الگ الگ نشتر، الگ الگ آپریشن بھی تجویز کر دیئے۔ البتہ ثبوتِ جرم کا معیار بہت اونچا کر دیا۔ یہ نہیں کہ ادھر شبہ پیدا ہوا، اُدھر سزا ٹھونک دی گئی۔

فطرتِ بشری جب تک اپنی موجودہ کمزوریوں کے ساتھ قائم ہے اور انسان کے حزنِ [illegible] میں گردش کر رہی ہے، مہر کے ساتھ قہر کی اور شاباش کی تسلیوں کے ساتھ تادیب کی گوشمالیوں کی حکیمانہ آمیزش لازمی ہی نہیں، عین رحمت و شفقت ہی کے مطالبہ کا پورا کرنا ہے۔ جس پاک ذات اور پاک صفات ہستی نے نہ صرف اپنی ان تعلیمات کے ذریعہ سے دنیا کو نمونۂ جنت بنا دینا چاہا بلکہ ۲۲، ۲۳ سال کے حیرت انگیز حد تک قلیل وقفہ میں ان کی عملی جھلک بھی اپنے وطن میں دکھا دی تھی اور کئی لاکھ مربع میل پر

عدل وفضل، مہر وشفقت کی عملداری، دوست دشمن سب کی آنکھوں کے سامنے قائم کرا دی تھی، آج تاریخ روایتِ مشہور کے مطابق اسی کی پیدائش کی ہے، لیکن اگر قرآن نے یہ بھی کہا ہوتا، جب بھی ان کارناموں سے واقف ہو جانے کے بعد عقلِ سلیم خود ہی سوال کرتی ہے کہ اگر اسے رحمتُ اللعالمین نہ کہتے تو آخر کیا کہہ کر پکارتے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یتیموں کا والی
غلاموں کا مولیٰ

"صدق جدید" لکھنؤ۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۵۸ء

بے یار و مددگار و بے برگ و نوا تنہا
دُنیا پہ ہُوا حاوی اک شخص کہ تھا تنہا
واں قتل کی سازش تھی، یاں سب پہ نوازش تھی
واں تیغ و سناں کیا کیا، یاں صدق و صفا تنہا
پیغام لیے پہنچا اسلام لیے پہنچا
دُنیا کے بیاباں میں اک آبلہ پا تنہا

—— انجم رومانی

یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ جون ۶۳۲ء کی چھ اور ربیع الاوّل ۱۱ھ کی غالباً ۱۳ تاریخ تھی جب دنیا میں آئی ہوئی روح اعظم مدینہ سے اپنے وطن اصلی کو واپس جا رہی تھی۔ وقت بالکل آخر تھا۔ سینہ میں غرغرہ شروع ہو چکا تھا کہ لب مبارک ہلے اور آس پاس جو قریبی عزیز اور تیمار دار تھے، انھوں نے کان لگا دیئے کہ اس وقت کوئی بہت اہم وصیت ارشاد ہو رہی ہو گی۔ خیال صحیح تھا۔ وصیت ارشاد ہوئی۔ لیکن، نہ محبوب بیوی حضرت عائشہؓ کے لیے تھی۔ نہ چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کے لئے۔ اور نہ جاں نثار صحابیوں' رفیقوں میں سے کسی کے حق میں بلکہ اس مختصر ارشاد کے بول کل یہ تھے:

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم نماز اور غلام!

یہ کیا ہے۔ نماز تک تو خیر کہ وہ بزرگ ترین عبادت تھی اور سیدالانبیاء کو اسکی ہدایت کرنا ہی تھی۔ لیکن یہ 'غلام' کیا معنی؟ ـــــ حیات مبارک کے بالکل آخری لمحوں میں فکر اور پروانہ گھر والوں کی تھی، نہ اس مملکت و سلطنت کی جو ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی۔ بلکہ ساری توجہ کے مرکز مظلوم و مجبور غلام قرار پائے۔

اللہ اللہ! یہ خوش قسمت غلام! سوچئے اور ایک بار پھر سوچئے کہ غلام دنیا کی تاریخ کے اس دور میں کیا مرتبہ و مقام رکھتے تھے؟ غلامی کا لفظ ہی ذلت و تحقیر کا مرادف تھا۔ اور مصر اور ایران اور یونان اور روم ساری دنیا کے تمدن مل کر بھی غلام کو غلامی کے عذاب سے نجات نہ دلا سکے تھے! ـــــ شاعر نے اگر ایسے ممدوح کی شان میں کہہ دیا:

تو یقیناً شاعری نہیں کی محض تاریخی واقعہ بیانی کی ہے۔

اور یہ محسنِ انسانیت وہی ہستی ہے جو زندگی میں فرمایا کرتی تھی کہ:

"یہ غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو خود کھاتے ہو وہ ان کو کھلاؤ ___ جو خود پہنتے ہو، وہ ان کو پہناؤ"

غلاموں کے ساتھ مساوات کا یہ وہ تخیل ہے جو تاریخ کے اس دور میں کسی کے دماغ میں گزر ہی نہیں رکھ سکتا تھا۔

زیدؓ بن حارثہ کا قصہ تو کیوں نہ سننے میں آیا ہوگا۔ کسی نصرانی خاندان کے تھے اور ابھی بچپن ہی کا زمانہ تھا کہ کسی جنگ میں قیدی ہو کر آئے۔ حکیم بن حزام جو حضرت خدیجہؓ کے عزیز تھے، ملک شام سے انہیں بطور غلام خرید کر لائے اور حضورؐ کی خدمت میں منتقل کر دیا۔ ادھر آپؐ نے اعلانِ نبوت کیا اور ادھر وہ ایمان لے آئے۔ آپؐ نے معاً آزاد کر کے غلامی سے اپنی فرزندی میں لے لیا۔ ادھر ان کے والد حیران و پریشان پتہ لگاتے لگاتے مکہ پہنچے اور فرزندِ دلبند کو پا کر قدرۃً انہیں گھر واپس لے جانا چاہا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ انھیں اختیار ہے زید اب اپنی مرضی کے مالک و مختار تھے۔ لیکن دنیا اس واقعہ کو حیرت کے کانوں سے سنے کہ اس آزاد شدہ غلام نے وطن جانے سے انکار کر دیا۔ باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور دامانِ رسولؐ نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ شفقت، حسنِ سلوک اور بندہ نوازی کا یہ اگر ایک اعجازی کارنامہ نہ تھا تو اور کیا تھا؟ ___

ایک انصاری صحابی ابو مسعود نامی تھے۔ ملک کے عام دستور کے مطابق ایک روز اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی:

"ابو مسعود! تمہیں جتنا اختیار اس غلام پر ہے۔ اس سے بڑھ کر اللہ کو تم پر اختیار ہے"

صحابی نے مڑ کر دیکھا تو کہنے والے خود حضور انورؐ تھے ___ اور اس مختصر و بلیغ وعظ کا اثر یہ ہوا کہ معاً انھوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ میں نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرتؐ!

میں غلاموں کا قصور کتنی بار معاف کروں؟

کچھ تامل کے بعد ارشاد ہوا کہ:

"ہر روز ستر بار!"

کوئی ٹھکانہ ہے رحمۃ اللعالمین کی اس وسعتِ کرم و رافت کا۔

غلاموں کو اصلی احساسِ کمتری خود لفظ "غلام" سے پیدا ہوتا تھا۔ اور اس ایک لفظ کے اندر ذلت و حقارت کی ایک پوری دنیا آباد معلوم ہوتی تھی۔ خلق کے اس معلم اعظمؐ نے اس ذہنی کیفیت کا پورا اور صحیح اندازہ کر کے ارشاد فرمایا کہ:

"کوئی ان لوگوں کو میرا غلام یا میری لونڈی نہ کہے بلکہ میرا بچہ یا میری بچی کہہ کر پکارے۔"

اور یتیموں کی تو کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ تاریخ سے جواب دیکھئے کہ دنیا میں عموماً اور عرب میں خصوصاً اس دورِ سعادت سے پہلے کیا حالت یتیموں کی تھی اور کیا حالت اس عہد کے بعد ہو گئی۔ اس رحمتِ دو عالمؐ نے ان ان طریقوں سے یتیموں اور بیچاروں کی دلدہی و دلداری کی اور ایسی ایسی شفقتوں سے انھیں نوازا کہ یتیمی بجائے قابلِ ننگ ہونے کے کچھ قابلِ رشک ہی نظر آنے لگی! ــــــ وہ جو خود دُرِّ یتیم تھا، یعنی ایسا موتی جو سیپ کے اندر اکیلا ہو۔ اور نفاست کے لحاظ سے منفرد و بے بہا اور اپنے بچپن میں یتیمی کی دُہری بلکہ تہری منزل سے گزر چکا۔ باپ کی شکل تو دیکھی ہی نہیں اور ماں کا سایہ ۶ برس کے سن میں اٹھ گیا تھا اور بارھویں سال دادا کی بھی شفقتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے کمال کے انتہائی مرتبہ پر پہنچ کر دنیا کو یہ پیام پہنچایا کہ جس شخص نے یتیم کو کھانے پینے میں شریک کیا اور اس کا خرچہ اٹھایا تو حشر کے دن سے آگ اور اسکے درمیان پردہ حائل ہو گیا۔ اور یہ خوشخبری سنائی کہ جس نے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے لئے ہر بال کے عوض ایک نیکی ہو گی۔ اور اس قانون کا بھی اطلاق کیا کہ مسلمانوں کی بستی میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم بچہ اچھی طرح پرورش پا رہا ہو۔ اور یہاں تک فرما دیا کہ یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں مجھ سے اسی طرح ملا ہوا ہو گا جس طرح ہاتھ کی یہ دو انگلیاں آس پاس ہیں ــــــ صلے اللہ علیٰ محمد و بارک وسلم

یوم النبی کا ایک نشریہ

یوم النبیؐ کا ایک نشریہ

بارہویں تاریخ مارچ ۶۲۴ء عیسوی کی ہے اور بارہویں تاریخ ماہ رمضان ۲ھ کی بھی، کہ مدینہ سے ایک قافلہ ایک بڑی مہم پہ ایک بڑے میدان کی طرف رواں ہے۔ فاصلہ بھی کچھ ایسا کم نہیں، کوئی ۸۰ منزل۔ قافلے میں آدمی تین سو سے اوپر اور اونٹ کُل ۷۰۔ نتیجہ یہ کہ ایک ایک اونٹ کے حصہ دار تین تین، اور سوار ہونا تو ایک وقت میں دو ہی کے لئے ممکن تھا اس لئے ایک ساتھی کو تو لامحالہ پیدل ہی چلنا پڑتا ——— اور یہی صورت قافلہ کے سردار کے لئے بھی۔ یہ صاحب ادھیڑ عمر کے۔ یہی کوئی ۵۲-۵۴ سال کی عمر کے۔ دونوں ساتھی سن میں چھوٹے۔ دونوں ادب کے ساتھ اور جذبۂ اطاعت و وفاداری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ:

"محترم سردار! ہم اپنی باری بہ خوشی بخشتے ہیں۔ ہم لوگ پیدل بہ آسانی چل لیں گے۔ ہمارے بجائے آپ ہی سواری پر تشریف رکھیں۔"

خلوص سے بھری ہوئی درخواست فدائیوں کی طرف سے تھی جو سن میں بھی چھوٹے تھے۔ مگر سنئے کہ محترم آقا کی طرف سے جواب کیا ملتا ہے۔ ہمارے آپ کے لفظوں میں یہ کہ:

"تم دونوں کچھ مجھ سے زیادہ قوی تو ہو نہیں (پیدل جیسے تم چل سکتے ہو، میں بھی چل سکتا ہوں) اور رہا وہ اجر جو پیدل چلنے کی مشقت سے حاصل ہوتا ہے تو اس کے بھی حاجتمند جیسے تم ویسے میں۔"

جواب آپ نے سن لیا؟

ملک و قوم کے سرداران ذی شان آج اس بیسویں صدی میں بھی جس آن بان، جس کر و فر سے سفر کرتے رہتے ہیں، اس کے نمونے آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ذرا ان نمونوں کو سامنے رکھ کر پھر اس سادے سے جواب کو جانچئے، تولیئے، پرکھئے اور اس پر جھوم جھوم اٹھئے۔ بقول شخصے:

چشم بر روئے اُو کشا باز بہ خویشتن نگر!

سوال وجواب، اب آپ سمجھ گئے، کس کس کے درمیان رہا؟ درخواست پیش کرنے والے تھے دو نو عمر صحابی، فدائیت کی منزلیں طے کئے ہوئے۔ اور جواب دینے والے تھے ہمارے رسول اکرمؐ۔ اللہ کے پیارے اور ہم سب کو درس ہدایت دے جانے والے۔ اب دیکھئے تو اس مختصر سے بول میں کتنا بڑا سبق دے گئے، شرافت کا، کسرِ نفس کا، شفقت کا، مساوات کا، اپنی عبدیت کا، اللہ سے اپنے ربط و تعلق کا اور اجرِ آخرت کی طلب و حرص کا۔

یہی ہے وہ محبوب و محترم اور سراپا عمل ہستی جس کی سالانہ یاد منانے ہم اور آپ جمع ہوئے ہیں۔ یہ پیاری اور برگزیدہ شخصیت تو اس قابل ہے کہ اس کی یاد سال میں ایک بار کیسی، سال کے ہر روز بلا ناغہ منائی جائے۔ اور دن میں ایک بار نہیں، پانچ پانچ بار ـــــ درود نامحدود اس ذات پاک پر۔

اب آپ میدانِ بدر تک تو آ ہی چکے ہیں تو ذرا ایک آدھ منظر اور دیکھتے چلئے۔ ادھر مقابل لشکرِ قریش ہر طرح ساز و سامان سے لیس تھا، کیا گھوڑے اور کیا اونٹ۔ کیا زرہ اور کیا تلوار، ہر اعتبار سے ـــــ اور ادھر مادی بے سروسامانی ہر معیار سے۔ اب رہی تعداد تو ادھر ایک اُدھر تین۔ اِدھر تین سو تیرہ، اُدھر ایک ہزار۔ اس پر بھی مردانگی اور خود اعتمادی کا یہ عالم کہ سرور و سردار نے مقابلہ کر ہی کے چھوڑا اور رہتی دنیا تک ایک باقی رہ جانے والا نقش ہمت و حوصلہ کا چھوڑ گیا۔

معرکۂ جنگ تو ۱۷۔ رمضان یوم جمعہ کو صبح گرم ہونا تھا۔ اس رات میں دیکھنے والے کیا دیکھتے ہیں کہ یہی دلیر و باہمت سردار ایک گوشہ میں بیٹھا ہُوا اپنے رب سے راز و نیاز میں معروف ہے چشم گریاں، قلب لرزاں، زبان پر الفاظ کچھ اس طرح کے امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں:

الٰہی!

اگر تو نے ان مٹھی بھر بندوں کو ہلاک کر دیا تو پھر اس زمین پر تیری بندگی کبھی نہ ہوگی۔

الٰہی!

تُو نے وعدہ امداد کا مجھ سے کیا ہے۔ تو اسے پورا فرما۔

الٰہی! تیری ہی مدد کی درخواست ہے!"

اللہ اللہ۔ ہمت و دلیری کا ذکر تو آپ ابھی سن ہی چکے تھے۔ عبدیت، خشیت، اعتماد علی اللہ کا نقشہ اب آپ نے دیکھ لیا؟ ـــــ سیرت و کردار کی کتنی گہرائیوں سے پردے اس ایک واقعۂ بدر سے ہٹ گئے اور اخلاق و روحانیت و معرفتِ حق کے کتنے سبق اس ایک واقعہ کے اندر مل گئے؟

تاریخ کا ورق ذرا سا اور الٹیئے۔

سال ہجری اب ۵ھ ہے اور مہینہ ذی قعدہ کا، کہ اکبارگی سارے دشمنوں نے مل کر مدینہ پر چڑھائی کی ٹھان لی۔ قریش خود بھی زور و طاقت میں کیا کم تھے، اب کے اپنے ساتھ کے لئے سارے ہی پُر قوت قبیلوں کو توڑ لیا، اور پھر ان سب کی کمک پر قوم یہود۔ اس ٹڈی دل نے آکر شہر مدینہ اور اس کے گرد و نواح کو گھیرے میں لے لیا۔ مقابلہ کے لئے مسلمانوں نے یہ ٹھہرائی کہ شہر سے باہر نکل کر اردگرد ایک خندق کھود لیجئے۔ خندق جنگی اغراض کے لئے باقاعدہ کھودنے کی یہاں مشق و مہارت کس کو تھی۔ کام رسولؐ ہی کی رہنمائی میں شروع ہوا اور بغیر کسی سفر، بنا پلٹن کی امداد کے، کام آپؐ نے یوں کرایا کہ جیسے کوئی ماہرِ فن انجنیئر ہی کراتا۔ اور اب حال یہ تھا کہ خود بھی کدال پھاوڑا ہاتھ میں لے، مزدوروں ہی کی طرح کھدائی کر رہے ہیں۔ جاں نثار صحابیوں کی نہیں نہیں کے باوجود۔ پورا شہر محاصرے میں۔ باہر سے رسد کی آمد بند، قحط کی سی صورت حال نمودار ہو گئی۔ بھوک سے نڈھال صحابیوں نے پیٹ پر پتھر باندھ لیے۔ اور اب جو دیکھا تو ان سے زیادہ فاقہ کشی کا عالم خود سرورِ عالمؐ پر طاری۔ شکم مبارک پر ایک پتھر کے بجائے دو دو پتھر بندھے ہوئے۔

دیکھ لیا آپ نے؟ ـــــ دنیا کی کس فوج کا سالار اپنے ادنیٰ ادنیٰ سپاہیوں کے ساتھ عمل میں مساوات اختیار کرے گا، اور مساوات کیسی۔ یہاں تو صورت سپاہیوں جیسے بازی لے جانے کی رہی ـــــ جو حکمرانوں میں سب سے بڑھ کر بااثر اور داناؤں کی صف میں سب سے بڑا عاقل اور عالموں میں سب سے بڑا فاضل تھا، وہ مزدوروں کی قطار میں شامل ہو کر بھی کیسا فرد کامل نکلا۔

پاک و پاکیزہ، مبارک و متبرک زندگی کا لب لباب یا عطر جو کچھ کہئے، ان ہی دو ایک جھلکیوں میں کھنچ آیا۔ اب ان کی شرح کرنے پر آئیے یا واقعات کو تفصیل سے ایک ایک کر کے گنائیے تو منٹ اور گھنٹے کیسے ساری رات تمام ہو جائے اور یہ ذکرِ جمیل تقریباً بھی تمام ہونے کو نہ آئے۔ اللہ کا حق سب سے زیادہ ادا کرنے

والا، اللہ کی عظمت کو دل میں سب سے بڑھ کر جگہ دینے والا، اللہ کی محبت میں رگ رگ سے غرق رہنے والا، اللہ کے بندوں میں سے ایک ایک کا حق پہچاننے والا، ہر مظلوم کا ہمدرد، ہر غمگین کا غم گسار، ہر عاجز و درماندہ کا دستگیر، ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء مطابق ۱۲۔ ربیع الاول ۵۲ قبل ہجرت اس دنیا کو خیر و برکت سے منور کرنے کو مکہ کی سرزمین پر ظاہر ہوا، اور ۸۔ جون ۶۳۲ء مطابق ۱۲۔ ربیع الاول ۱۱ھ کو مدینہ کی سرزمین سے اپنے مالک و مولا کے حضور میں روانہ ہو گیا۔ عمر سن قمری کے حساب سے ۶۲ سال کی پائی۔

نبوت کے حصہ میں کل ۲۲ سال کی مدت آئی اور اس میں سے بھی ۱۲ سال کا زمانہ دعوت و موعظت اور ایک بڑی ہی ضدی اور سرکش قوم کی طرف سے مخالفت کی نذر ہو گیا۔ مسلمان تو خیر اس ذات کو وسیلۂ نجات سمجھتے ہی ہیں اور اس کی شان میں

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کا کلمہ پڑھتے رہتے ہی ہیں۔ باقی اس کی امانت، دیانت، عفت، ہمت، شرافت، حسن اخلاق، فہم و فراست، تدبیر و تدبر، جود و دستی، دلیری و مردانگی کی گواہی جس طرح پچھلے منکروں نے دی، اسی طرح آج تک یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے فاضل و عاقل دیتے چلے آ رہے ہیں، اور اس کے نعت گویوں کی فہرست میں دس بیس نہیں پچاسوں بلکہ سینکڑوں ہندوؤں کے نام نظر آتے ہیں۔ اسی کے نام کی پکار آج ساڑھے تیرہ سو سال سے ہر روز پانچ پانچ بار دنیا کے گوشے گوشے سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ وہ کل دس سال کی ننھی سی مدت میں دنیا میں عظیم ترین انقلاب برپا کر گیا۔ اپنے پیچھے ایک منظم حکومت ۱۲ لاکھ مربع میل پر چھوڑ گیا، اور وہ بھی لاکھوں انسانوں کے قتل کے بعد نہیں، ہزار ہا جانیں لینے کے بعد نہیں، بلکہ حیرت کے کانوں سے سنئے کہ اس کی ساری لڑائیوں میں دوست دشمن سب ملا کر کل جمع ایک ہزار اٹھارہ انسان کام آئے ——— ۲۵۹، اپنے اور ۷۵۹ دشمن کے ——— جبھی تو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے گیارہویں ایڈیشن کا بیان ہے کہ دنیا کی مذہبی شخصیتوں میں سب سے بڑھ کر کامیاب وہی گزری ہے:

THE MOST SUCCESSFUL OF ALL

RELIGIOUS PERSONALITIES.

اور اس کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید کی بابت اسی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی گواہی ہے کہ روئے زمین پر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب یہی ہے:

THE MOST WIDELY READ BOOK IN THE WORLD

اور آج جو اُمت اس کے نام کا کلمہ پڑھتی ہے، اس کی تعداد دنیا کے مختلف ملکوں میں ملا کر ۴۰ کروڑ کی ہے۔ اس ساری زندگی کو اگر ایک مستقل اور مسلسل معجزہ نہ کہئے تو آخر اور کیا کہئے!

سیرۃ النبیؐ یا صحیفۂ سلیمانی

جس نام کو اللہ نے پسند کیا، کوئی اس کی بلندیوں کو ناپنے کا پیمانہ کہاں سے لاتے؟ جس ذکر کو عرش والے نے پھیلایا، اُس کی وسعتوں کا احاطہ زمین والے کہاں سے کر پاتیں؟ فرشتوں نے درود پڑھا، انبیاء نے سلام بھیجا، پاکوں نے ورودِ مسعود کی بشارتیں سنائیں صدیقوں نے ظہورِ نور کی دعائیں کیں، اچھوں اور سچوں نے نورِ ظہور کی خبریں پہنچائیں اور پھیلائیں! بخاری اور مسلم نے، ترمذی اور نسائی نے، ابنِ اسحاق اور ابن ہشام نے ملفوظات و معمولات کی ایک ایک سطر قلمبند کی سینکڑوں نے سیر و مغازی پر لکھا، ہزاروں نے سوانح و حالات پر دفتر کا دفتر تیار کر دیا۔ یہاں تک کہ جو ازل میں "تعریف کیا گیا" کہہ کر پکارا گیا تھا، اس کی مدح و ستائش منکروں اور بیگانوں، دشمنوں اور باغیوں کی زبان سے کرائی گئی اور ولہاؤسن اور نولڈیکی، میور اور مارگولیس کے مُنہ اُس بڑے کی بڑائی پر گواہی دینے کو کُھلے! اور ان میں سے جو سب سے زیادہ بدبیں تھا، اُسی نے یہ اعلانیہ کہا: کہ

"محمدؐ نبی کے سیرت نگاروں کا طویل سلسلہ ختم ہونا تو ناممکن معلوم ہوتا ہے،
البتہ اس صف میں جگہ پانا خود ایک فخر و عزت کی چیز ہے۔"

(مارگولیس، دیباچہ، ص۱)

چودھویں صدی ہجری کے ثلث دوم میں یہ سعادت، ایک نمایاں رنگ میں، کچھ شبلی اعظم گڑھی کے حصے میں آئی اور بہت کچھ سلیمان ندوی کے۔ بنیادیں اُستاد نے کھودیں اور بھریں، لیکن دیواریں ابھی کچھ یوں ہی سی اٹھنے پائی تھیں، کہ صلہ کی تمنا اور مُزد کے اشتیاق

میں مزدور خود، مالک کے پاس پہنچ گیا۔ در دیواروں کو بلند کرنا، عمارت کو سلیقہ سے بنانا، اور سنوارنا، خوش نصیب شاگرد و جانشین کے نصیب میں آیا۔ سیرۃ النبی کی جلدیں، پہلی، دوسری اور تیسری، اپنے اپنے وقت پر نکل نکل کر شائع ہو چکیں، یہ چوتھی جلد ہے جو فلسکیپ کی بڑی تقطیع پر کچھ کم سات سو صفحے کی ضخامت کے ساتھ اب پریس سے باہر آتی ہے۔ کشیدہ قامتی کے جلو میں کتابت کی رعنائیاں اور طباعت کی زیبائیاں، کاغذ کی نفاستیں اور خوش مذاقی کی رعایتیں، نورٌ علیٰ نور!

کہتے ہیں کہ خالق کو پہچاننے کا جو حق ہے، اُس طرح آج تک کوئی نہیں پہچان سکا ہے نہ عالم نہ زاہد نہ عارف نہ عاشق۔ ٹھیک ہے۔ لیکن نبی کی معرفت کا جو حق ہے اُسے بھی کون اُمتی کبھی ادا کر سکا ہے؟ کامل کے احوال کون ناقص پا سکا ہے؟ جو چھتہ ہیں کہ ان کے مقامات کسی خام کے احاطۂ گرفت میں آ پاتے ہیں؟ اور پھر وہ نبی، جو نبی الانبیاء ہو، جس کی دعوت ساری کائنات کے لیے ہو، جس کا پیام ہر ملک، ہر قوم، ہر دور، ہر زمانہ کے ہر فرد کے لیے ہو، ممکن نہیں کہ اُسے ہمیشہ ایک ہی نظر سے دیکھا جائے، اور محال ہے کہ اُس کی حیاتِ طیبہ کے کسی ایک ہی رُخ پر، ہمیشہ کے لیے قناعت کر لی جائے، اُسے ہر زمانہ میں نئی نئی عینکوں سے دیکھا جائے گا، اور ہر دور میں، پیام، اور پیامبر، دونوں کی تفسیریں اور تعبیریں، نئی نئی ڈھونڈھی جائیں گی اور نئی نئی پیش ہو کر رہیں گی۔

وحی الٰہی پر ایمان لے آنے کے بعد، صاحب وحی کی شخصیت ضمنی و ثانوی حیثیت نہیں رکھتی، مرکزی و اساسی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ راوی اگر معتبر، تو روایت بھی ضرور قابلِ لحاظ ہو جاتی ہے، داعی اگر سچا، تو دعوت بھی کم از کم قابلِ غور۔ پیمبر کی شخصیت اگر

محترم اور قابلِ عزت، تو اس کا لایا ہوا اور سُنایا ہوا پیام بھی کم از کم اتنی وقعت کے قابل ضرور ہو جاتا ہے کہ غور و توجہ کے ساتھ سُن لیا جاتے۔ یہی رازِ تکوینی ہے اس کا کہ سیرۃ نبی الانبیاء پر اب تک دفتر کے دفتر، الماریوں پر الماریاں، کتب خانوں پر کتبخانے تیار کرا دیتے گئے، اور حیاتِ طیبہ کا ایک ایک جزئیہ اس تفصیل، تحقیق و استناد کے ساتھ جمع و محفوظ ہو گیا، جس کی نظیر ملوک و سلاطین، امراء و وزراء، شعراء و حکماء، علماء و اولیاء بلکہ انبیاء سابقین کی بھی تاریخ میں نہیں ملتی!

لیکن اب تک تاریخ محض تاریخ کی حیثیت سے لکھی گئی، سیرت کے واقعات کو واقعات ہی کی حیثیت سے لوگوں نے پڑھا، اور جانا اور جانچا۔

سیرت نگاری خود ایک مقصود تھی، کسی دوسرے مقصد کے لیے آلہ یا واسطہ نہ تھی۔ مغرب نے برسرِ عروج آتے ہی یہ نقطۂ نظر بدل دیا۔ اب تاریخ مقصود بالذات نہ رہی، ایک دوسرے مقصد کا آلہ یا واسطہ بن گئی۔ اور مورخین مغرب فخریہ کہنے لگے، کہ تاریخ بہ حیثیت تاریخ بے معنی ہے، جب تک واقعات تاریخی میں ایک خاص ترتیب پیدا کر کے ان سے سیاسی یا ذہنی نتائج نہ نکالے جائیں۔ سیرتِ مبارکہ کا مطالعہ ان محققین جدید اس غرض سے شروع کیا کہ اس نئے صاحبِ سیرت کے دعووں کا نقص ہاتھ آتے اور صاحبِ سیرت کی صورت اس طرح بگاڑ کر، اور مسخ کر کے پیش کی جاتے، کہ ایمان کا تازہ ہونا الگ رہا، ایمان سرے سے، دلوں سے رُخصت ہو جاتے، اور جو سراپا حسن و جمال تھا، اس کی مصوری میں یہ صنعت و دستکاری صرف کی جاتے، کہ دیکھنے والے (نعوذ باللہ) ڈر ڈر، بیزار ہو ہو کر، وحشت کھا کھا کر اس کی طرف سے بھاگنے لگیں۔

اب "میلادِ شہیدی" کا دور رخصت ہو چکا تھا، اب غلام امام شہید کا ذوق و شوق بیکار تھا۔ اب سیرت نگاری تاریخ کے دائرہ سے نکل کر علم کلام کی ایک مستقل شاخ بن چکی تھی۔ وقت کی ضرورت بھی صدائیں لگا رہی تھی، اور کوئی کان نہ تھا، جو اسے سُنے۔ شبلی نعمانی کی تُربت کو اللہ ٹھنڈی رکھے، کہ انھوں نے اس آواز کو سُنا۔ وقت کی ضرورت کو سمجھے، اور سب سے پہلے سیرت کو کلامی رنگ دیا۔ ان کی ضخیم سیرت النبی میں اسے نہ ڈھونڈھیے کہ تزویج آمنہ کے وقت کتنی عورتیں نذرِ آتشِ رشک ہو کر رہ گئیں اور ولادت شریفہ کے وقت ایوانِ کسریٰ کے کنگروں پر کیا کیا گزر گئی۔ ہاں اُس کے اوراق میں یہ دیکھنا ہو تو دیکھیے، کہ عرب کی اصلاح اور کُل دُنیا کی اصلاح، وہ بے نظیر مصلح عالم کس طرح کر گیا۔ اور جو ہمیشہ کے چور اور ڈاکو، سفاک اور جلاد، حرامکار اور شراب نوش، سود خوار و قمار باز، تھے۔ انھیں اس کی نظر اکسیر اثر کس طرح بس دیکھتے ہی دیکھتے، متقی و پاکباز، عبادت گزار و شب بیدار، رحمدل و غمخوار، متدین و پیکر ایثار، بنا گئی۔

پہلی اور دوسری اور تیسری جلدوں میں واقعات زندگی اوّل سے آخر تک بیان ہو چکے، غزوات، سراپا ان کے اسباب، نتائج، مکہ کے یتیمؐ کے مصائب و مظلومیت مدینہ کے فرمانروا کا رحم و کرم، ازواج، اولاد، معجزات، امکان معجزات، وقوعِ معجزات، محقق و مستند واقعات معجزات، ان سب پر بحث ہو چکی۔ بعض پر مجمل، اکثر پر مفصل۔ اب یہ چوتھی جلد ہے، جو پیشِ نظر ہے۔ اور چار کے عدد کی اہمیت کوئی "چار یار" کے ماننے والوں اور "فلک چہارم" کی رفعت کے جاننے والوں کے دل سے پوچھے! بہ زبانِ مثنوی ؎

روشنی بر دفتر چارم بریز ۔ کافتاب از چرخ چارم کرد خیز
ایں ز چارم نور دہ خورشید وار ۔ تا بتابد بر بلاد و بر دیار

یہ جلد منصبِ نبوت پر ہے۔ اس میں نبی کی شخصیت پر اتنی بحث نہیں، جتنی نبی
کی نبوت پر ہے۔ اس لیے قدرتاً ابتدائی حصہ خود حقیقتِ نبوت اور اس کے لوازم و
خصائص کے لیے وقف ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ منصبِ پیمبری ہے کیا، اس کے
ملنے کے معنی کیا ہیں، اور یہ ملتا ہے تو کیا کیا مل جاتا ہے اس کے معاً بعد نبی کے ماحول
کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی جس وقت اور جہاں نبی مبعوث ہوتے تھے اس "وقت"
کا کیا عالم تھا اور وہاں کی کیا کیفیت تھی۔ پیامبر اپنا پیام سنانے کھڑے ہوتے، تو
یہ تو معلوم ہی ہو جانا چاہیے کہ "کسے" سنا رہے تھے، سننے والے کون تھے، کیسے تھے،
کس دماغی و اخلاقی سطح پر تھے، اور "کب" سنا رہے تھے۔ وہ وقت کیا تھا، وقت کی فضا
کیا تھی، وقت کے مقتضیات و مصالح کیا تھے۔ اس طرح عرب کی مفصل اور ہند
ایران، روم وغیرہ کی مجمل، اخلاقی و مذہبی تاریخ آگئی اب جب یہ سب معلوم ہو چکا،
تو گفتگو اس پر شروع ہوئی، کہ اللہ کے سفیر کی سفارت ناکام رہی یا کامیاب ؟
یہ پیام پہنچانے والا کچھ 'کرنے' بھی آیا تھا، کچھ کر کے بھی گیا، یا ایک بے اختیار
اور بے بس واعظ کی طرح اس کا کام محض اونگھتے ہوئے سامعین کو وعظ سنا کر واپس
چلا جاتا تھا۔ تبلیغ نبوی، اس کے اصول، اس کے کامیابی کے اسباب پر مفصل اور
دلنشیں مقالات اس سوال کے تحت میں آجاتے ہیں۔ ان سب مراتب کے بعد اب نفس
"پیام" کی تشریح شروع ہوتی ہے۔ حقیقتِ منصب پیامبر سمجھ میں آگئی، یہ بھی معلوم
ہو چکا، کہ پیام، فلاں قوم کو فلاں وقت سنایا گیا، یہ بھی روشن ہو چکا کہ سفارت
ناکام نہیں رہی۔ لیکن یہ اہم سوال تو اب بھی رہ گیا، کہ آخر خود وہ پیام تھا کیا ؟
کتاب کے نصف سے زائد حصہ میں اسی "پیام" کی تشریح ہے۔

لیکن جس تفصیل اور نکتہ سنجی کے ساتھ قلم کا ایک ایک قدم اٹھایا گیا ہے ناممکن
تھا کہ پیام کی ساری تشریح ساڑھے تین، چار سو صفحات میں سما جاتی۔ اس لیے کتاب

تمام ہوگئی، لیکن "پیام"، ناتمام رہا۔ اسلام جس پیام کا نام ہے، وہ متعدد عنوانات پر مشتمل ہے۔ مثلاً عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق۔ اور ان میں سے ہر عنوان بجائے خود متعدد اجزاء میں منقسم ہے، کتاب میں "پیام" کا صرف عنوان اول یعنی جزوِ عقائد آسکا ہے، اور ساڑھے تین سو صفحات سے زائد اسی کی نذر ہو گئے ہیں۔ اس جزو کے تحتانی عنوانات جلی اس قسم کے ہیں :-

اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، رسولوں پر ایمان، کتب الٰہی پر ایمان، آخرت قضا و قدر وغیرہا جو کتاب اسلام کے پیام پر ہے، حق تھا، کہ اس کی ترتیب بھی کتاب اسلام ہی کی طرح، ایسی ہی باقاعدہ، دلکش و دلنشیں ہو!

مشک کی تعریف یہ کی گئی ہے، کہ خود اپنی خوشبو دے، نہ یہ کہ کوئی دلال اس کی تعریف میں زمین، آسمان کے قلابے ملاتا رہے۔ پڑھنے والوں کی طبیعت جھنجلارہی ہوگی، کہ اشتیاق تو اتنا دلایا جارہا ہے، لیکن نمونہ ذرا سا بھی پیش نہیں کیا جاتا۔ بہتر ہے "خروار" کا اندازہ "مشت" سے خود فرمائیں ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کی مختصر حقیقت :-

"گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے، کہ نبی میں علم و فہم کے تین ذریعے ہیں۔ وحی۔ ملکۂ نبوت، اور عام عقل بشری۔ ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لیے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔ کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں، اور دوسرے اوپر کے تشریحات میں مستقل طور سے اُن پر بحثیں ہو چکی ہیں، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لیے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے، اِس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے، کہ جن علما نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے، انھوں نے اپنے اپنے

مذاق کے مطابق اس کے لیے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں، مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں، سلف صالحین میں سے بعض کے اس کو القاء فی الرّوع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمت قلبیہ، توفیقِ ازلی اور قوت تبیین سے تعبیر کیا ہے[1]۔ امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو "پیغمبرانہ قوت اجتہاد" کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں، یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت، جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرار شریعت کا بیان اور خالق کی حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔"

"انبیائے کرام کے اُن ربّانی انعامات کی فہرست پڑھیے، جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے۔ تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد سر فہرست جو چیز نظر آئے گی، وہ "علم نبوت" ہے۔ جس کو کہیں ذکر، (یادداشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سمجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں ارادت (دکھا دینا سُجھا دینا) کہا گیا ہے۔ ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے، اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مُراد وحی تو اس لیے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس

---

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالۃ میں مذکور ہیں۔

لیے نہیں، کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں، کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے۔ اس بنا پر اس سے مراد عقل نبوی اور حکمتِ نبوی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا" (ص ۱۱۱-۱۱۲)

پیامبر کے پیام کی بہت ہی مختصر و جامع تشریح:-

"آپ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ چار ابواب پر منقسم ہے، اور انھیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے"!

آپ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ، یا یوں کہو کہ اس کا ایک رُخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت۔ اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے، اور دوسرا عالم شہود سے۔ پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرماں بردار غلام کا ہے، اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارہ کا ہے۔ خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے، اُس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قوائے اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام عقیدہ ہے، اگر اُن قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے۔ باہم انسانوں انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے، اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں، اگر اُن کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے"!

"قرآنِ پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے، اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے، اور انھیں دونوں

کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے۔ عمل صالح کی تین قسمیں ہیں۔ خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل۔ بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانونِ الٰہی کی پابندی، اور اُن کے ساتھ محبت الفت، اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ۔ اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو، اسلام عبادت کہتا ہے۔ لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے۔ الغرض محمد رسول اللہ صلعم جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ انھیں چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے۔ یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، انھیں کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لیے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔"

(صـ۳۱۶ ۔ صـ۳۱۷)

ایمان و عمل کے باہمی ربط و تعلق پر تقریر، بہ طور لُب و خلاصہ:۔

"اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اُس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اُس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اُس کا اثر ہو سکتا ہے، یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں۔ اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا۔ ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح، تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے۔ اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے۔ کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔"

"یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے

یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم ورواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دارومدار رکھا۔ چنانچہ حواریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ عملیات نہیں، بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے۔ اسلام کی پہلی تکمیل شان اس بارے میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کرکے اُن دونوں کو جمع کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان پر اور نہ تنہا عمل پر، بلکہ ایمان صحیح اور عمل صالح کی جامعیت پر موقوف ہے۔ الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت (جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت وسبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔"

"یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا، تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ایمان نے اُس کی زبان سے اُتر کر اُس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآنِ پاک ہر نیکی اور اور ہر خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقع پر اُس نے مسلمانوں کو

یاایھا الذین آمنوا | اے وہ لوگو! جو ایمان لاتے ہو

کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں۔ بہت سے موقعوں پر

ان کنتم مؤمنین | اگر تم ایمان والے ہو۔

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں۔" (ص ۶۸۱-۶۸۲)

جہنم کی ابدیت و عدم ابدیت کا مسئلہ شروع سے مختلف فیہ رہا ہے۔ علماء محققین اہل سنت کا بڑا گروہ جنت کی طرح جہنم کے بھی خلود کا قائل ہے، لیکن خود اہلِ سُنّت کے اندر بھی شیخ محی الدین ابن عربی جیسے زبردست اہل باطن اور ابنِ تیمیہ و ابن قیم جیسے زبردست اہلِ ظاہر، اس عقیدہ کے مخالف بالآخر فنائے جہنم و انقطاعِ عذاب کے قائل گزرے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اسی مرجوح شق کو اختیار فرمایا ہے، اور عقلی و نقلی، قیاسی و نصی، دونوں قسم کے دلائل و شواہد سے اس کمزور پہلو کو جس قدر محکم و مدلل بنا سکے ہیں، بنایا ہے۔ اس بے علم و کوتاہ نظر کی فہم ناقص میں، کتاب کا ضعیف ترین حصہ یہی ہے۔ جن جن آیات و احادیث سے عدم خلود پر استدلال کیا گیا ہے۔ انھیں سے کہیں زائد صفائی اور بے تکلفی کے ساتھ دوام و خلود ہی نکلتا ہے۔ ص ۶۰۱ پر آیۂ کریمہ لابثین فیہا احقابا (نبا) کا ترجمہ یہ دے کر کہ "دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے" بطور نتیجہ یہ فرمایا گیا ہے

"لیکن بالآخران صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا، اور

خدا نے چاہا تو اُن کو نجات ملے گی"

گویا بنائے استدلال لفظ احقاب ہے، جس کا ترجمہ صدہا سال کی محدود د متعین مدت سے کیا گیا ہے، اس پر یہ ادب گزارش ہے، کہ اکابر مفسرین کی تصریحات اس معنی کی تائید نہیں کرتیں۔ تفسیر ابن عباسؓ میں ہے :۔

لا بثین فیہا احقاباً، ای مقیمین فی جہنم احقاباً حقباً بعد حقب والحقب الواحد ثمانون سنۃ والسنۃ ثلثمائۃ وستون یوماً والیوم الواحد الف سنۃ بما تعد اہل الدنیا ویقال لا یعلم عدد تلک الاحقاب الا اللہ فلا ینقطع عنہم۔	اہلِ نار جہنم میں پڑے رہیں گے، حُقب کے بعد حُقب متصلاً، اور ایک حُقب برابر ہوتا ہے اسی سال کے، مگر ایسا سال، جس کے دن تین سو ساٹھ ہوتے ہیں اور ہر دن، دنیا والوں کے حساب سے ایک ہزار سال کا! اور کہا جاتا ہے کہ ان

احقاب کا شمار بجز حق تعالیٰ کے اور کسی کو معلوم نہیں، پس اس کے تسلسل سے اہلِ نار کو نجات نہ ہوگی (یعنی عذاب ان سے کبھی رفع نہ ہوگا)۔

اور امام ابنِ جریرؒ، حقب کی تفسیر میں اسی سال سے لے کر، ہزار سال کی مختلف مدتیں روایت کرنے کے ساتھ ہی قتادہؒ کا قول نقل کرتے ہیں، کہ

عن قتادہ قال اللہ لا بثین فیہا احقاباً وہو ما لا انقطاع لہ کلما مضیٰ حقب جاء حقب بعدہ	یہ سلسلۂ عذاب کبھی ختم نہ ہوگا، ایک حقب کے ختم پر دوسرا احقب شروع ہوتا جائے گا۔

اور ربیع اور قتادہ دونوں کا قول نقل کرتے ہیں، کہ

قالا ان ہذہ الاحقاب لا انقضاء لہا ولا انقطاع۔	ان احقاب کا نہ کبھی خاتمہ ہوگا نہ ان سے نجات ملے گی۔

اور نیشاپوری، ایک امام لغت و نحو فرا کا قول پیش کرتے ہیں کہ

فزعم الفراء ان اصله الترادف والتتابع ای دهوراً مترادفة لا تكاد تتناهی كلما مضی حقب تبعه آخر	احقابا، کا مفہوم ترادف و تتابع (تسلسل و تواتر) کا ہے یعنی ایسے زمانے جو پے در پے آتے جائیں گے، اور

ایک زمانہ ختم ہو رہا ہوگا، کہ دوسرا شروع ہو جاتے گا۔

اور پھر حقب کی تفسیر میں مختلف طول طویل مدتیں نقل کرکے سوال کرتے ہیں کہ بہرحال یہ مدتیں تو محدود و متعین ہی رہیں، تو کیا اہل نار، خصوصاً طاغیوں کا ذکر انھیں کا ذکر سیاق عبارت میں ہے) عذاب، محدود و متناہی رہے گا؟ جواب میں کہتے ہیں،

قلنا الحقب متناه ولكن الاحقاب لا نسلم انها متناهية فان الجمع لا يلزم تناهي آحاده فيجوز ان يكون المعنى كلما مضى حقب تبعه آخر۔	"حقب" بے شک ایک زمانہ متناہی ہے، لیکن "احقاب" کے معنی زمانہ متناہیہ کے نہیں۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ ایک زمانہ عذاب جب ختم ہونے

پر آتے گا، تو دوسرا شروع ہو جاتے گا۔

اور پھر فراء، لغوی و نحوی کا فیصلہ درج کرتے ہیں۔

قال الفراء سلمنا ان الاحقاب تفيد التناهي لكن بالمفهوم والنصوص الدالة على التابيد كفر لهم يريدون ان يخرجوا من النار وما هم بخارجين منها تدل بالمنطوق ولا شك ان المنطوق راجح	فراء نے کہا، یہ مانا کہ احقاب سے مراد ایک محدود زمانہ ہے، لیکن یہ صرف مفہوم سے متبادر ہوتا ہے۔ درآنحالیکہ نصوص صریحہ اس زمانہ کی ابدیت بتا رہی ہیں، مثلاً یہ آیت،

یریدون ان یخرجوا من النار الخ۔ اور ان کی دلالت "منطوق" ہے اور "منطوق" ہی کی دلالت لائق ترجیح ہے۔

اور حافظ ابن کثیرؒ نے ابن جریرہی کے روایت کیے ہوئے متعدد اقوال نقل کرکے، حسنؒ کا یہ قول اضافہ کیا ہے

قال اما الاحقاب فلیس لہا عدۃ الا الخلود فی النار۔	زمانوں کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے مراد صرف دوام عذاب سے ہے۔

اور بغویؒ، صاحب معالم نے حسنؒ کا قول زیادہ بسط و تفصیل سے پیش کیا ہے

قال الحسن ان اللہ لم یجعل لاہل النار مدۃ بل قال لابثین فیہا احقابا فواللہ ماہو الا انہ اذا مضی حقب دخل آخر ثم آخر الی الابد فلیس للاحقاب عدۃ الا الخلود	حق تعالیٰ نے اہل جہنم کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں کی ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ اس میں احقاب تک پڑے رہیں گے۔ پس بخدا اس کے معنی اور کچھ نہیں، سوا اس کے کہ ہر زمانہ (حقب) کے خاتمہ پر دوسرا زمانہ (حقب) شروع ہوتا رہے گا۔ پس احقاب کی کوئی حد نہیں، بجز ہمیشگی کے

زمخشری کی اہمیت سب کو مسلم ہے۔ احقابا کی تفسیر میں سب سے زیادہ صفائی کے ساتھ دوام عذاب پر زور دیتے ہیں

حقبا بعد حقب کلما مضی حقب تبعہ آخر کما غیر نہایۃ ولا یکاد یستعمل الحقب والحقبۃ الا حیث یراد تتابع الازمنۃ وتوالیہا والاشتقاق یشہد لذلک	حقب کے بعد پھر حقب مطلب یہ ہے کہ جب ایک زمانہ ختم ہوگا پھر دوسرا زمانہ شروع ہو جائے گا اور اس کا کبھی انقطاع نہ ہوگا۔ حقب و حقبہ کا استعمال ہی ایسے تسلسل و توالی کے موقع پر ہوتا ہے، جیسا کہ لفظ کے اشتقاق سے ظاہر ہے۔

اور ایسے ہی اقوال بیضاوی، مدارک، بحر المحیط، جلالین و خازن وغیرہ نے بھی دیئے

ہیں، اور سب نے آیت سے عذاب کی ابدیت ہی مراد لی ہے۔ اور اکثر نے عدم تابید کے مفہوم پر پُر زور انکار کیا ہے۔ ان سب کا نقل کرنا یقیناً غیر ضروری ہے۔

ان حضرات کا بھی فہم قرآن اگر معتبر نہ ہوگا، تو اور کس کا ہوگا۔ ان اہل فن کے متفقہ فیصلہ سے انکار کرنا تھا، تو شہادت بھی بڑی زبردست و قوی پیش کرنی ضروری تھی۔ 'احقاب' کے معنی، گویا بلا تردد و اختلاف "صدہا سال" کے کر دینا، آسانی سے سمجھ میں آجانے والی چیز نہیں۔

اہل لغت و زبان کا بھی گوشہ چشم اُس طرف نہیں۔ حقبہ اور حقب کے تو مختلف معانی آتے ہیں۔

الحقبة بالکسر من الدھر مدة لا وقت لھا والسنة . . . والحقب بالضم وبضمتین ثمانون سنة او اکثر والدھر والسنة۔ (قاموس)	حقبہ زمانہ کا وہ جزو ہے جس کی مدت نامعلوم ہو، اور ایک سال بھی اس کے معنی ہیں . . . اور حُقُب اور حُقْب سے مراد اسی سال یا زائد کی مدت ہے، نیز زمانہ، نیز ایک سال۔
الحقب ای الدھر قیل والحقبة ثمانون عاماً والصحیح ان الحقبة مدة من الزمان مبھمة (مفردات راغب)	حقب کے معنی زمانہ کے ہیں، اور حقبہ کے معنی اسی سال کی مدت لیے گئے ہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حقبہ، زمانہ کی مدت نامعلوم ہے۔

لیکن "احقاباً" (بصیغہ جمع) کے باب میں، خصوصاً جبکہ وہ ترکیب میں لابثین فیھا، کے ساتھ واقع ہوا ہے، اہل لغت کو کوئی تردد یا شک نہیں۔ سجستانی کے "غرایب القرآن" میں ہے،

ای کلما مضیٰ حقب تبعہ حقب آخر	اور جب ایک زمانہ ختم ہونے لگے گا، تو دوسرا شروع ہو جائے گا، ہمیشہ ہمیش تک۔

اور لسان العرب میں ’احقاب‘ کے معنیٰ ’زمانے‘ (الاحقاب الدہور) دینے کے بعد فراء لغوی و نحوی کا وہی قول ”لابثین فیہا احقابا“ کے معنیٰ میں نقل کیا ہے، جو بضمن تفسیر پیشتر گزر چکا ہے، اور اس میں فراء کی زبانی، اُن لوگوں کے خیال کی صریح تردید بھی موجود ہے، جو آیت سے انقطاع عذاب کا استنباط کرتے ہیں، اور اس کے آگے صحیح معنیٰ یہ درج کیے ہیں، کہ

والمعنی انہم یلبثون فیہا احقابا کلما مضیٰ حقب تبعہ حقب آخر۔	وہ اس میں قرنہا قرن پڑے رہیں گے اور جب ایک قرن عذاب ختم ہونے لگے گا تو دوسرا شروع ہو جایگا۔

اور اس کے بعد ایک دوسرے امام لغت زجاج کے حوالہ سے آیت کا مطلب لکھا ہے۔

وہم خالدون فی النار ابدا	یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں پڑے رہیں گے۔

فاضل مصنف نے مسئلہ عدم خلود نار پر اسی ایک آیت سے نہیں اور بھی متعدد آیات اور احادیث سے استناد کیا ہے، لیکن وہ سارے استدلالات ایسے ہی محلِ نظر ہیں۔ اس ایک آیت کا بیان محض نمونہ کے طور پر ذرا کھول کے کر دیا گیا۔

دلائل شرعی کے علاوہ جو عقلی قرائن و قیاسات اس رائے کی تائید میں قائم کیے

لبثوا اسی مفہوم کو اردو کے بعض مترجمین نے یوں ادا کیا ہے ”... احقاب“ یعنی لگے رہیں اُس کے قرنوں بے شمار“ (شاہ رفیع الدین دہلوی) ”جس میں وہ بے انتہا زمانوں رہیں گے“ (مولانا تھانوی مدظلہ)

گئے ہیں، اُن کی ایک مثال یہ ہے :-

"کوئی کہہ سکتا ہے، کہ بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے، کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک وصاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات وکنایات کی بجائے اُن کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے، کہ اگر ایسا کیا جاتا، تو یہ اُن مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا، کہ اس سے اُن کے نادم وتائب ہونے کے بجائے اُن میں اور خودسری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی، اور اعمال آئندہ کے نتائج بد سے نڈرپن اور بے خوفی آجاتی۔ اور یہ تنبیہ واصلاح وتدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا" (ص۱۶۷)

اس حسن تعلیل پر بہ ادب یہ سوال ہے کہ مصلحت اگر عموم مغفرت کے اخفاء ہی میں تھی، تو اس کا اظہار کیونکر درست وجائز ہوگا ؟ اور جس راز کو راز ہی رہنا تھا، اس کا افشاء اور اعلان کیونکر قرین مصلحت تصور کر لیا جائے ؟ کوئی آقا اگر اپنے نافرمان ملازمین کو سخت تہدید کرے، تو کیونکر جائز ودرست ہوگا کہ جو خدام آقا کے مزاج شناس ہیں، اور مراتب قرب رکھنے والے، وہ ان معتوبوں کو یہ سمجھانے لگیں کہ آقا کی ظاہری خفگی پر نہ جانا، اُس کا منشا تمہیں نقصان پہنچانا نہیں، محض ڈرانا دھمکا دینا ہے ؟ یہ آقا کے مصالح کا احترام ہوا یا اس کے برعکس، آقا کے مصالح عتاب کو بالکل غارت کر کے رکھ دینا ؟

طاؤس کے "پائے زشت" کا بیان ہو چکا۔ لیکن "پائے طاؤس" کے علاوہ طاؤس میں اور جو کچھ ہے، وہ حسن وخوبی اور تمام تر نقش ونگاری ہے کتاب کی توصیف وتعریف کی صرف ایک کمزور بحث کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی جتنے مباحث ہیں، وہ داد سے اور توصیف

سے مستغنی۔ کلام کا دشوار ترین حصہ عقائد ہی کا حصہ ہے۔ متکلم نے اگر عقائد کو تسلیم کرلیا تو آگے عبادات وغیرہ میں کوئی نظری و اعتقادی دشواری چنداں باقی نہیں رہتی فاضل مصنف بحمد اللہ اس ہفتخوان کو بڑی آسانی سے طے کرگئے ہیں۔ ان کا طریق استدلال یہ ہے کہ ہر دعوے کی بنیاد کلام مجید پر رکھتے ہیں۔ اور صرف اصول و مہمات ہی نہیں ان کے جزئیات بلکہ فروع در فروع تک پر کلام پاک ہی سے استشہاد کرتے جاتے ہیں۔ اور کہیں کہیں جہاں مناسب موقع پاتے ہیں مزید توضیح و تشریح کے لیے ضمناً احادیث نبوی کو بھی پیش کردیتے ہیں۔ عقل و نقل کے درمیان تطبیق کا سررشتہ کسی لمحہ بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ [illegible]

عقائد میں محدثین اور متکلمین کے درمیان نزاع صدیوں سے چلی آتی ہے۔ حضرات محدثین، نصوص ظاہری کو سختی سے پکڑے ہوتے اس جانب سے بالکل غیر ملتفت رہتے ہیں، کہ ان کی تحقیقات کا منکرین و متشککین پر کیا اثر پڑے گا۔ اور عقلی حیثیت سے کیا کیا ایرادات ان عقائد پر وارد ہوں گی۔ متکلمین اس کے برعکس، منکرین پر حقانیت اسلام ثابت کرنے کی دھن میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ عقلیات سے مطابق کرنے کے لیے خود نصوص میں کھینچ تان شروع کردیتے ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ اس نزاع کو مٹا کر دونوں طریقوں کو باہم ملا دیا جائے۔ اللہ نے یہ ضرورت اس صحیفۂ سلیمانیہ کے قالب میں پوری کردی ہے۔ اس کا مصنف ایک ہی وقت میں محدث اور ظاہری قسم کا محدث بھی ہے۔ اور دل اور خیال متکلم بھی۔ کلام پاک گویا اسے نوکِ زباں ہے۔ ہر ہر جزئیہ کے لیے وہ قرآن مجید ہی کو اپنا سہارا بناتے ہوتے ہے، اور نصوص حدیثی کیا معنی، نصوص قرآنی سے سرمو تجاوز نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی اس کے ہر عقیدۂ اسلامی کو، ہر پیام قرآنی کو عقل کی میزان میں اس طرح تولا ہے کہ منکرین اور متشککین کے سارے شکوک و شبہات از خود دفع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ذالک فضل اللہ

یؤتیہ من یشآء۔

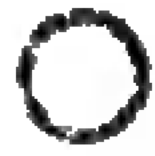
بنگالے تو پھر بنگالے ہیں۔ ایک جدید مسئلہ میں خود اپنوں کو ایک عرصہ سے حیرانی و سرگشتگی ہے۔ اور وہ مسئلہ خود منصب نبوت کا ہے۔ سوال اپنوں ہی کے ایک گروہ کی طرف سے پیدا ہو رہا ہے، کہ پیمبر کی رائے بہرحال ایک بشری رائے ہوتی ہے، پھر کتاب اللہ کے ہوتے ہوتے سنّت کی پابندی کے کیا معنی ہیں؟ حجت جو کچھ ہے، وہ صرف کتاب الٰہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دفتر احادیث کیسا؟ سوال اگرچہ محض بے غوری اور فقدان تعمق سے پیدا ہوا ہے، لیکن بہرحال جب پیدا ہو چکا ہے، تو مفصّل وشافی جواب ضروری ہو گیا ہے۔ "منصب نبوت" کے شارح کی نظر اس اہم نکتہ پر پہنچی اور کتاب کے آغاز ہی میں اِس مسئلہ پر بڑی شرح وبسط سے بحث کی ہے، جو انشاء اللہ ہر صاحب فہم سلیم کے حق میں نافع وشافی ہوگی۔ آج کے متکلّم کو بھی علم کلام کے نئے نئے مسائل (یا کم از کم اُن پُرانے مسائل ہی کا، جو اَب بالکل نیا قالب اور نیا پیکر اختیار کر چکے ہیں) مقابلہ کرنا ہے اور مورخ وسیرت نگار کا متکلّم بن جانا، تو اسی دَور کے خصوصیات میں سے ہے۔

معانی ومطالب کے لحاظ سے مدلّل وتشفّی بخش تصنیف فی الجملہ ناقص رہ جاتی، اگر عبارت ایسی ہوتی، کہ کتاب کے ساتھ ساتھ ایک شرح کتاب کی بھی ضرورت رہ جاتی، لیکن جانشین شبلی کے ہاں اِس نقص کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا، کتاب بلحاظ معانی جس قدر بلند ہے، اُسی قدر بلحاظ زبان وانداز بیان، متین سلیس وشگفتہ، مباحث ایسے نازک، لیکن اوسط درجہ کی استعداد کا شخص بے تکلف پڑھتا چلا جائے گا۔ گتھیاں از خود سلجھتی چلی جائیں گی اور پڑھنے والے کو یہ بھی نہ پتہ چلے گا کہ دماغ پر کہاں اور کب زور دینا پڑا! اُردو زبان کی خوش نصیبی ہے، کہ اُس میں ایسی کتاب وجود میں آگئی، جس کی نظیر اُردو میں کیا، فارسی بلکہ عربی میں بھی تلاش کرنی آسان نہیں۔ ؎ "ایں سعادت بزور بازو نیست"

سلطانِ ما محمدؐ

(مقالاتِ سیرت)

مولانا عبدالماجد دریابادی



مقدمہ و ترتیبِ نو
تحسین فراقی

مقبول اکیڈمی شاہراہ قائدِاعظم لاہور